برصغیر کے ترقی پسند سیاسی مفکر مولانا عبید اللہ سندھی کا پیغام فکر و عمل

نوجوان جدید تعلیمی و جمہوری نظام فکر کو اپنائیں

تحقیق و تحریر: ڈاکٹر محمد جاوید

نوجوان جدید تعلیمی و جمہوری نظام فکر کو اپنائیں
تحقیق و تحریر: ڈاکٹر محمد جاوید

نوجوان جدید تعلیمی و جمہوری نظامِ فکر کو اپنائیں

برصغیر کے ترقی پسند سیاسی مفکر مولانا عبیداللہ سندھی کا پیغامِ فکر و عمل

تحقیق و تحریر

ڈاکٹر محمد جاوید

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

کتاب :نوجوان جدید تعلیمی و جمہوری نظام فکر کو اپنائیں

مصنف : ڈاکٹر محمد جاوید

اشاعتِ اوّل : ۱۰مارچ ۲۰۰۱۸ء

قیمت :

ISBN:

ناشر:

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو محترم جناب

شیخِ طریقت حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائپوری رحمہ اللہ

کے نام کرتا ہوں جن کی صحبتِ فیض کی بدولت

مولانا عبید اللہ سندھی کے فکر سے متعارف ہونے کا موقع میسر آیا۔

(اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین)

عنوانات

☆ دیباچہ ....

باب اول جدید یورپین علوم کی تحصیل ....

۱۔ عقل دشمنی کی بجائے، عقلی قوتوں کی آبیاری ....

۲۔ یورپین علوم کی تحصیل کے لئے انگریزی زبان کا علم ....

باب دوم جمہوری نظامِ فکر وقت کا اولین تقاضہ ....

۱۔ جمہوری دور کا آغاز اور اس کی اہمیت ....

باب سوم جمہوری نظام کے قیام کے لئے نوجوان نسل کی تربیت ....

۱۔ موجودہ معاشرے کی حالت زار ....

۲۔ نوجوان نسل پہ اعتماد ....

۳۔ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا اہتمام ....

۴۔ انفرادیت پسندی اور شخصیت پرستی کے نقصانات ....

۵۔ حقیقی جمہوری سیاسی پارٹی کے خدوخال ....

باب چہارم جمہوریت کے قیام کے لئے پسماندہ طبقات کی تربیت

۱۔ ووٹ کی اہمیت اور اس کا استعمال ....

☆ حوالہ جات ....

دیباچہ

زیرِنظر کتاب میں مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی افکار و نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے، عام طور پہ آپ کا تعارف ایک عالم دین یا تحریک آزادی کے رہنما کے طور پہ کرایا جاتا ہے، ہمارے معاشرے کے بہت کم لوگ ان کو ایک سیاسی مدبر و مفکر کے طور پہ جانتے ہیں، آپ بیسویں صدی میں ہندوستان میں جاری مختلف سیاسی تحاریک میں متحرک سیاسی قائدین جن میں قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، جواہرلعل نہرو، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ اگرچہ آپ انگریز سامراج کے خلاف چلنے والی تحریک کی پاداش میں طویل جلاوطنی میں رہے، لیکن آپ کی بیرون ملک کاوشیں وطن کی آزادی پہ منتج ہوئیں۔

آپ واحد مسلمان سیاسی مفکر ہیں جنہوں نے کھل کر مسلمان معاشروں کی رجعت پسندی، انتہاپسندی اور آمرانہ ذہنیتوں پہ تنقید کی، اور انہیں مروجہ زوال سے نکلنے کے لئے ایک ایسا مربوط سیاسی پروگرام دیا جس کی بدولت عصر حاضر سے ہم آہنگ سیاسی، تعلیمی و معاشی نظام تشکیل دیئے جاسکتے ہیں۔

آپ کے سیاسی افکار بند کمروں کی دیو مالائی فلسفیاتی کرشمہ سازی نہ تھی، بلکہ اس سیاسی فکر کے در پردہ کئی سالوں پہ محیط عملی سیاسی جدو جہد تھی جس کے دوران آپ نے افغانستان، روس، ترکی، جاپان، جرمن اور عرب سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ مل کر بڑے بڑے سیاسی منصوبے بنائے، یہ جدو جہد اگرچہ ان گنت

مصائب سے پر تھی لیکن بے تحاشہ سیاسی وعلمی تجربات کا باعث بنی، جب آپ اپنے وطن سے چلے تھے اس مشن کے ساتھ'' کہ پوری ''اسلامی دنیا'' کو متحد کر کے انگریز سامراج کے خلاف ایک عالمی سطح کی تحریک برپا کی جائے اور ہندوستان کو آزادی دلائی جائے۔لیکن بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے سامنے ایک نہ چلی، ان گنت سیاسی تجربات اور بتدریج ناکامیوں کے بعد جب اس سیاسی سفر کا اختتام ہوا تو انہیں اپنے گذشتہ سیاسی نظریات وسیاسی حکمت عملی پہ نظر ثانی کرنی پڑی۔

انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ اب بیسویں صدی عیسوی میں یورپ سے اٹھنے والی تحریکات دنیا بھر کی اقوام پہ علمی، سیاسی، معاشی اور عسکری طور پہ اثر انداز ہو رہی ہیں، اب وقت کے تقاضے یکسر بدل چکے ہیں، جدید سائنسی علوم اور جمہوری نظاموں نے معاشروں کی کایہ پلٹنا شروع کر دی ہے انہوں نے اپنی آنکھوں سے پرانے اور فرسودہ نظریات، دستوروں اور سیاسی نظاموں کو ملیامیٹ ہوتے ہوئے دیکھا۔

انقلاب فرانس کے اسباب، انقلاب روس کے حقائق، سلطنت عثمانیہ کا زوال اور اسباب اور یورپ سے نمودار ہونے والی علمی اور سیاسی تحریکات کے تجزیئے اور مسلسل علمی وفکری تحقیق وجستجو کے بعد ایک حقیقت پسند سیاسی مفکر کی حیثیت سے اپنی ناکامیوں کو کھلے دل سے تسلیم کیا اور ان ناکامیوں کی حقیقی وجوہات کو جاننے اور سمجھنے کے بعد اپنی نئی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ سیاسی فکر پیش کی، اور اس کو عمل میں لانے کے لئے ایک باقاعدہ سیاسی پروگرام متعارف کروایا۔ آپ کی سیاسی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اب ''شاہی نظام'' یعنی آمریت کی جگہ ''جمہوری نظام'' ہی چلے گا۔ شاہیت چاہے جس قدر مقدس ہو اب باطل ہے۔ مذہب کے نام پہ ''عالمی اتحاد'' اب ناممکن ہے۔ ہر قوم کا اپنا قومی تشخص ہے اور وہ اسی

کے تحت ترقی کی منازل طے کرنا چاہتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بغیر قومیں حقیقی آزادی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتیں۔

انہوں نے انسانی ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ طبقاتی نظام کو قرار دیا اور اس سے چھٹکارے کے لئے نوجوان نسل کی جدید تعلیم اور جمہوری نظام فکر کے تحت شعوری تربیت اور ایک حقیقی جمہوری سیاسی پارٹی کو ضروری قرار دیا۔ان کے نزدیک انسان دوستی اور خدمت انسانیت کا جذبہ ہی ترقی کا ضامن ہے۔مذہب،فرقہ،نسل اور زبان کی بنیاد پہ تعصب غلط اور قوم کو تباہ کرنے کی سازش ہے۔انہوں نے مسلمان معاشروں کو اپنی فرسودہ مذہبیت جس کی بنیاد تعصب،تنگ نظری،عقل دشمنی اور رجعت پسندی پہ رکھ دی گئی ہے کو ترک کرنے کی تلقین کی۔

معروف دانشور ڈاکٹر تارا چند کے بقول:

''مارچ 1939ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور کراچی کے بندرگاہ پر اترے اپنے ساتھ ایک متنوع اور متحرک جذبات کا خزانہ لائے اور ایسے اسلام پر پختہ عقیدہ جس کے مذہبی سماجی اور سیاسی اصولوں میں لچک پیدا کر دی گئی ہو وہ اپنی عمر کے سترویں سال کے قریب پہنچ رہے تھے زندگی کے نشیب وفراز اور متضاد مشرقی اور مغربی تصورات کی جنگ نے ان کے دماغ میں نئی نالیوں کو کھود کر تیار کر دیا تھا اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے وہ اصول جن پر ان کا پختہ عقیدہ تھا وہ مسلمانوں اور مجموعی طور پر تمام ہندوستانیوں کو اتحاد،آزادی اور مرفہ الحالی کی جانب لے جائیں گے۔''(1)

مولانا عبیداللہ سندھی ایک درویش صفت انقلابی سیاسی مفکر جن کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ ہی اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لئے کبھی مال بنایا اور نہ ہی کسی طرح کی شہرت

ان کے مد نظر رہی، اور نہ ہی اپنی ذات اور اپنے خاندان کو کسی بھی حوالے سے مقدس بنا کر مخصوص حلقے کو رواج دیا اور نہ ہی کسی ایسے سلسلے کی بنیاد رکھی جو کہ آئندہ نسلوں کے لئے رجعت پسندی اور کسی بھی طرح کی گروہیت کو جنم دینے کا باعث بنے۔ لہذا آپ کا ذاتی کردار اور سیاسی افکار ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔

آج کے قومی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں آپ کے سیاسی افکار سیاسیات کے طالب علموں سے لے کر سیاسی رہنماؤں، سیاسی جماعتوں کے کارکنان کے لئے مشعل راہ ہیں۔

زیر نظر کتاب اس تحقیقی مقالے سے ماخوذ ہے جسے:

''مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی نظریات کا
عصر حاضر کے تناظر میں تحقیقی جائزہ''

کے عنوان سے جامعہ کراچی کے شعبہ سیاسیات سے 2010ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔

زیر نظر کتاب میں عصر حاضر کے دو اہم ترین تقاضے یعنی ''جدید علوم کی تحصیل'' اور ''جمہوری نظام فکر کی تشکیل'' کے حوالے سے مولانا عبیداللہ سندھی کے نقطہ نظر کو ''چار ابواب'' میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے نوجوان نسل کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ان سیاسی نظریات کو سمجھنے اور اس پہ عمل کرنے کی تلقین کی۔

کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے مختلف سیاسی مقالہ جات وخطبات میں مندرج افکار کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا جائے، نہ قلم اس قابل ہے نہ فہم اس قدر عمیق۔ بس یہ

ایک ادنیٰ سی کوشش ہے کہ معاشرے میں آپ کے سیاسی افکار کونوجوان نسل میں زیر بحث لانے کاایک سلسلہ شروع کیا جائے۔

مَیں نے اپنی پوری کوشش کی ہے کہ آپ کے کہے گئے الفاظ حوالہ جات کے ساتھ پیش کروں۔لیکن پھر بھی اگر کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی ہوتو اہل علم سے گذارش ہے کہ وہ میری تصیح اور مزید رہنمائی فرمائیں۔

شکریہ

ڈاکٹر محمد جاوید

حوالہ دیباچہ:۔(1) تاراچند،ڈاکٹر،مسلم افکار سیاست،(ترتیب:ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری)،لاہور،مکی دارالکتب،2002ء،ص 200

باب اول

جدید یورپین علوم کی تحصیل

عقل دشمنی کی بجائے عقلی قوتوں کی آبیاری

کائنات ارض وسماء میں انسان کو اگر امتیازی حیثیت حاصل ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی استعدادوں سے مالا مال ہے جس سے وہ خود سے دیکھنے، سوچنے، سمجھنے اور سوچ سمجھ کر عمل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہے یہی سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت یا استعداد عقل سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ کائنات کا تمام نظام عقلی بنیادوں پر منظّم ہے اور انسان اپنی عقلیت ہی کی طاقت سے فطرت کے قوانین سے ہمکلام ہوتا ہے۔ مفکرین کا کہنا ہے کہ

”ہر تمدن کی اساس عقل پر ہوتی ہے اور عقلیت ہی تمدنی ارتقاء کو آگے بڑھاتی ہے مگر نئی عقل جب نئے تجربے، نئے مشاہدے، نئی دریافتیں اور نئے انکشافات لیکر بوڑھی عقل کے خلاف عمل میں اترتی ہے تو پرانی عقل اور اس کی بنیاد پر قائم تمدن کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ یوں وہ نئے مشاہدوں اور نئے تجربوں سے استدلال کے میدان میں جیتنے کی بجائے جبر وتشدد اور ظلم وستم کے میدان میں جیتنے کو کوشش کرتی ہے حالانکہ عقلیت، سماج، روایت اور ترقی ایک متحرک عمل ہے ہر ایک دوسرے سے نشونما پاتا ہے۔“

معلوم انسانی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کو

بروئے کار لاتے ہوئے ہر دور میں نت نئی تہذیبوں اور تمدنوں کی تخلیق وارتقاء کے سلسلے کو قائم و دائم رکھتے ہوئے اسے عصر حاضر تک پہنچایا اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے،انسان کے اندر چونکہ فطری طور پہ یہ خوبی موجود ہے کہ وہ ''خوب سے خوب تر کی تلاش'' میں رہتا ہے،یعنی اپنی عقلی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے،لہذا اگر اس کی اس عقلی وفکری حرکت پہ کسی قسم کی پابندی لگائی جائے تو وہ عقلی جمود کا شکار ہو جائے گا، اور جس کا نتیجہ اس کی سماجی موت کی صورت میں نکلتا ہے۔مولانا عبیداللہ سندھی کے نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ انسانی فطرت کے اس جوہر یعنی عقلی ارتقاء کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں وہ معاشرے کے اندر ایسا تعلیمی وتربیتی ماحول یا نظام ضروری قرار دیتے ہیں جس کی خصوصیت یہ ہو کہ وہاں افراد کی عقلی قوتیں آزادی کے ساتھ پروان چڑھیں،عقلی صلاحیتوں پہ کسی طرح کی قدغن لگانے کو وہ علمی ترقی میں رکاوٹ سمجھتے تھے ان کے نزدیک انسان ہی وہ کہلاتا ہے جو خود سوچ کر آگے بڑھے، یعنی اپنی عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی راہیں خود بنائے۔آپ بیان کرتے ہیں:

''انسان کی انسانیت میں اعلیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ ایک بات سمجھ لے اور پھر اسے عمل میں لائے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ذمہ اٹھائے۔وہ اینٹ پتھر نہیں ہے کہ ہلایا تو ہل گیا ورنہ ساکن پڑا ہے۔ہم اپنی روزانہ زندگی میں ''نوکر'' اور غلام'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔نوکر اور غلام خود سوچ کر اپنی ذمہ داری پر کوئی کام نہیں کر سکتے،اس لئے ان پر ''انسان'' کا لفظ پوری طرح صادق نہیں آتا۔اصل میں انسان کا ترجمہ حر(آزاد) ہے یعنی وہ خود سوچ کر اپنی ذمہ داری سے کام کرتا ہے۔''(1)

مسلمان معاشروں میں اکثر یہ غلط فہمی پیدا کر دی گئی ہے کہ خدا ناخواستہ انبیاء کی تعلیمات خلاف عقل ہیں، مولانا عبیداللہ سندھی اس مغالطے کو دور کرنا چاہتے ہیں کہ انبیاء کی تعلیم کا خدا ناخواستہ عقل سے کوئی ٹکراؤ ہے وہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسانی معاشرہ ایسی طرز پر پیدا کر دیتا کہ اس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہوتا جیسے باقی ساری کائنات ہے لیکن اس کی حکمت نے چاہا کہ انسان اپنی سمجھ اور ہمت سے اچھا نظام قائم کرے اس کے لئے اسے عقل دی اور عقل کی مزید رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم علیہم السلام بھیج کر انسانی جماعتوں کو تعلیم دیتا رہا۔''(2)

مزید فرماتے ہیں کہ ''انبیاء کی تعلیم عقلمندوں کے واسطے ایسی ہے جیسے وہ کاشتکار جو کنویں سے کھیت کو سیراب کر رہا ہے اور اس پر بارش ہو جائے، تو وہ اس کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھے گا، غرض جس طرح کسان کے واسطے بارش ہے جیسے وہ کاشتکار جو کنویں سے کھیت کو سیراب کر رہا ہے اور اس پر بارش ہو جاتی ہے تو وہ اس کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھے گا غرض جس طرح کسان کے واسطے بارش ایک زائد رحمت ہے اسی طرح انسان پر بھی انبیاء کی تعلیم زائد رحمت ہے۔ انبیاء کی تابعداری کا دعویٰ کرنے والوں (جاہل علماء) کی ایک جماعت نے عقلمندوں سے لڑائی خرید رکھی ہے اور عقلمندوں کا چھوٹا طبقہ ان کی بات نہیں سمجھ سکتا اس لئے ان دونوں کا جھگڑا ختم ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس قسم کے لوگوں کو سامنے رکھ کر کبھی قرآن مجید کی آیات کو حل نہیں کرنا چاہتے غرض مطلب یہ ہے کہ صحیح عقل اور انبیاء کے طریقے میں کبھی معاوضہ نہیں ہو سکتا اور انبیاء کے طریقہ کو صحیح سمجھنے والا کبھی عقلمندوں سے نہیں لڑتا۔''(3)

جہاں مولانا عبیداللہ سندھی اس طبقے کو جو انبیاء کی تعلیم کو بنیاد بنا کر عقلی قوتوں کو لگام ڈالنے کی کوششوں میں لگا رہا ہے اور معاشرے کے اندر اس قسم کا ایک منفی جھگڑا پیدا کر دیا ہے، پہ تنقید کرتے ہیں اور انہیں اپنا طرز عمل درست کرنے کی بات کرتے ہیں وہیں وہ اس نام نہاد

عقل مند طبقات کو بھی مخاطب کرتے ہیں جو عقل مند ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن عقل کے تقاضوں سے سے عاری ہوتے ہیں، آپ فرماتے ہیں۔

''عقل اور انبیاء کے طریقہ کو آپس میں لڑا دینا، یہ بے عقلوں کے طریقہ کا کام ہے، یعنی انبیاء کا طریقہ ہمیشہ صحیح فطری اور عقل پر ہوتا ہے۔ عقلمندوں میں بعض ایسی جماعتیں پیدا ہوگئیں کہ وہ خود تو عقل نہیں رکھتیں مگر عقلمندوں کی باتیں ان کو یاد ہیں اور خود ان میں عقل نہیں ہے یہ عقل مند کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، عقلمند وہ ہے جس کو فطرۃً عقل ملی ہو اور وہ فطرت کو سمجھے اور اس پر چلے، ایسے عقلمند جن میں خود تو عقل نہیں مگر انبیاء کے طریقے کی جھوٹی سچی تابعداری کا دعویٰ رکھتے ہیں تو یہ بھی عقلمند نہیں ہیں۔ فطری عقل تھوڑی یا زیادہ جو اپنے اندازے پر رہے اس جگہ وہ مراد ہے''(4)

عقلی قوتیں چونکہ انسان کی فطرت کا حصہ ہیں اور انکی آبیاری ایک اہم ترین فطری تقاضہ ہے جس کے بغیر انسانی تمدن ارتقاء پذیر نہیں ہوسکتا، لہٰذا مولانا عبید اللہ سندھی انسانوں کی تعلیم وتربیت فطری تقاضوں کے مطابق کرنے پہ زور دیتے ہیں تاکہ معاشرے کے ذہنی وعلمی ارتقاء کا کا سلسلہ نہ رکے، اور انسانی فطرت بخوشی ایسے تعلیمی نظام کو قبول کرے، اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ''جب انسان کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو اس کے طبعی تقاضوں کے مطابق ہے تو وہ ایسا محسوس کرتا ہے، گویا اسے بھولی بسری چیز یاد دلائی گئی ہے اس لئے جو علم انسان کو دیا جائے جو اخلاق انسان کو سکھائے جائیں۔ اور سوسائٹی کا جو نظام اسے بتایا جائے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ فطرت انسانی پکار اٹھے کہ یہ میری ہی چیز ہے، جو مجھے بھولی ہوئی تھی۔''(5)

مولانا عبیداللہ سندھی کا عقل کی اہمیت کو بیان کرنے کا مقصد دورجدید کے تعلیمی نظام کی اس روح کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا، جس کو بنیاد بنا کر تجربات ومشاہدات کی نت نئی دنیائیں بسائیں گئیں، جنہوں نے کائنات کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرنا شروع کردیا اور نت نئے علوم وفلسفے وجود میں لاکر سائنس اور ٹیکنالوجی کی اختراع سے تہذیب وتمدن کی نئی عمارتیں کھڑی کی گئیں، آپ مسلمان معاشروں کو بھی اس انقلاب سے مستفید ہونے کی دعوت دیتے ہیں وہ ایسا تعلیمی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں جو خود سے سوچ کر آگے بڑھنے کے لئے تیار کرے، جو تعلیم وتربیت سے عقلی صلاحیتوں کو بڑھائے اور خود سے سوالات کرنے اور پھر ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی استعداد پیدا کرے، اس کے نتیجے میں تحقیق، تخلیق کا کلچر پیدا ہو، اندھی تقلید کا مزاج معاشرے سے ختم ہو، اور روشن خیال دماغ پرورش پائیں اور کائنات میں پھیلی نعمتوں سے مستفیض ہوسکے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اپنے عمیق مطالعے سے اس حقیقت تک پہنچ چکے تھے کہ سیاسی نظام کی تخلیق وارتقاء کا عمل ہو یا یا اقتصادی نظاموں کی تشکیل وترقی ہو ان سب کی روح رواں ''عقلی قوتیں'' ہی ہیں، اس کا اقرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''سیاسی طاقت سیاسی قوت، اجتماعی اور اقتصادی قوت سب عقلی غلبے کیساتھ مربوط ہیں''(6)

آج کی دنیا پہ اگر غور کریں انسان نے اسی عقلی غلبے کی بنیاد پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ جن اقوام میں فکری اور عقلی آزادی کو تحقیق و تخلیق کے کلچر سے سینچا گیا، جہاں علمی ڈائیلاگ کا ماحول پیدا کیا گیا، علم کو اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی نظاموں کی تخلیق کا ذریعہ بنایا گیا، علم وعقل دوستی کو معاشرے کی روح ورواں بنایا

گیا، ان معاشروں میں ایجادات ہو رہی ہیں، نئے نئے علوم و فلسفے وجود میں آ رہے ہیں، دنیا جب سوتی ہے تو ان معاشروں کی لیبارٹریاں جاگ رہی ہوتی ہیں، ان اقوام کی اسی عقلی و فکری آزادی اور علم دوستی نے آج انہیں اتنا طاقتور بنا دیا کہ دنیا کی معاشی و تجارتی منڈیاں ان کی دسترس میں آ گئیں، دنیا ان کی ٹیکنالوجی کی محتاج ہے، معاشی طاقت سے انہوں نے سیاسی اثر رسوخ پیدا کیا اور دنیا کے اکثر ممالک کو جہاں عقلی قوتوں کو غلامی سے دوچار رکھا گیا انہیں اپنا دست نگر بنا دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عقلی قوتوں کی آبیاری کیے بغیر اقوام دور جدید کی مارکیٹ اکانومی اور مینوفیکچرنگ کلچر کی مارکیٹ کی جنگ میں سرخرو نہیں ہو سکتیں۔ عقلی قوتوں کی آبیاری ہی انسانی معاشروں کے ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ قدرت کے اس انمول عطیے کو جن اقوام نے استعمال کرنا سیکھا انہوں نے یقینی کامیابیاں حاصل کیں اور جنہوں نے اس کی قدر نہیں کی فقط دیو مالائی تصورات کو اوڑھنا بچھونا بنا کر ''عقلی قوتوں کے جن'' کو ''رجعت پسندی'' کی بوتل میں بند کرنے کی کوشش کی آج وہ فکری، سیاسی، معاشی پسماندگی کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہیں۔

یورپین علوم کی تحصیل کے لئے انگریزی زبان کا علم

مولانا عبید اللہ سندھی وہ مسلمان سیاسی مفکر ہیں جنہوں نے دور جدید کے تقاضوں کا شعوری ادراک کیا اور انتہائی وسعت نظری سے اپنے ان گزشتہ نظریات کو جو ایک زمانے میں قابل عمل اور نتائج کے حامل تھے اور اب وہ بے کار محض تھے سے اپنی برات کا اعلان کیا اور اپنی قوم کو ارتقاء کی نئی حقیقتوں سے آشنا کرنے کے لئے اپنے پرانے اور فرسودہ افکار سے کنارہ کش ہو کر اس نئے اور جاندار نظام کو اپنانے کی تلقین کی، جس کی ابتداء یورپ سے ہو چکی تھی آپ نے نئی نسل کو یورپ میں اٹھنے والی ان علمی و سیاسی تحریکات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی، جن کی

بدولت یورپ نے معاشی و سیاسی برتری حاصل کی، آپ نے اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے جمود اور پسماندگی دور کرنے کے لئے معاشرتی انقلاب کی طرف رہنمائی کی، آپ نے ایک ایسے انقلاب کی دعوت دی جو کہ نئی فکر، نئے انداز اور نئی حکمت عملی کا متقاضی تھا، اسی بنا پہ آپ ''انقلاب'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک انقلاب کا کوئی ''دیو مالائی'' تصور نہیں تھا بلکہ وہ نوجوانوں کو جب ''انقلابی'' بننے کی طرف مائل کرتے ہیں تو اس میں ان کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ وہ نوجوانوں کو زمانے کے ان بدلتے ہوئے حقیقی اور عملی تقاضوں سے آشنا کر دیں اور مسلمان نوجوان رجعت پسندی کی بجائے ترقی پسندی اور ارتقاء کے اس فلسفے کو سمجھیں جس سے ہر زمانے میں نئے نظام جنم لیتے ہیں اس طرح ''انقلابی نقطہ نظر'' سے حالات کا جائزہ لیں اور ایسی فکر کو اپنائیں جو عصری تقاضوں سے میل کھائے۔

آپ یورپ کے علوم سے بتدریج استفادہ ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن چونکہ یورپ کے تمام علوم اور ان کی تحقیقات انگریزی زبان میں ہیں لہذا آپ نے ضروری قرار دیا کہ نوجوان انگریزی زبان میں مہارت حاصل کریں۔ آپ کا کہنا تھا ''ہمارا پروگرام وقتی نہیں ہم ایک طویل راہ عمل کی طرف بلاتے ہیں آج یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے طالب علموں کو اپنا سارا پروگرام پڑھا دیں، اس وقت ہم آپ کو صرف یہ کہتے ہیں کہ آپ انگریزی پڑھیں تا کہ آج کل یورپ میں جو ہلچل ہے اور وہاں جو انقلاب برپا ہے اس کے حالات سے آپ واقف ہو سکیں۔''(7)

سائنسی علوم کی تحصیل کے لئے انگریزی زبان کو ذریعہ بنانے کے حوالے سے مزید فرماتے ہیں ''میں سائنس سیکھنے کا کسی صورت انکار نہیں کر سکتا، مگر اس کے لئے عربی کو آلہ نہیں بنانا چاہئے بلکہ انگریزی کے ذریعے اس کی تکمیل ضرور ہے۔''(8)

ہندوستان میں جب انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی تحریک زوروں پہ تھی، اور اس تحریک کے نتیجے میں انگریزوں کے خلاف اس قدر نفرت عام تھی کہ لوگ انگریزی سے بھی نفرت کرتے تھے، خاص طور پہ مسلمان انگریزی زبان سے سخت نفرت کرتے تھے، مسلمان علماء اور مشائخ تعلیمی وتربیتی حلقہ جات میں انگریزی کو سیکھنا اوراس کی تعلیم دینا حرام سمجھتے تھے، بچوں کو انگریزی سیکھنے سے منع کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ حالت یہ تھی کہ ملک کے بڑے بڑے مدارس جن میں دیوبند وبریلی غیرہ شامل تھےان میں بھی انگریزی زبان کے حوالے سے کوئی مضمون موجود نہیں تھا۔ سرسید احمد خان نے علی گڑھ بنایا، انگریزی پڑھانے شروع کی، تو ان کے خلاف مخالفت کا طوفان کھڑا ہوگیا، لیکن ان کے ادارے سے کئی بڑے نام پیدا ہوئے جنہوں نے آگے چل کر ہندوستان کی سیاست میں اور تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا، لیکن اس کے باوجود معاشرے کی عام ذہنیت یہی تھی لہذا مسلمان نوجوان تذبذب کا شکار تھے، جدید تعلیم سے دوری کی وجہ سے مسلمان دیگر قومیتوں کے مقابلے میں پسماندہ ہونا شروع ہوگئے۔ اگرچہ سرسید احمد خان نے علی گڑھ کی صورت میں اس حوالے سے بہت کام کیا، لیکن وہ عمومی طور پہ مسلمانوں کو اس طرف راغب کرنے میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ اس زمانے میں جو بھی جدید تعلیم جس کا تعلق یورپ سے تھا کو حاصل کرنے کے حوالے سے تعلیم دینا اوراس کی ترغیب دینا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، ہر طرف سے مخالفتوں اور تنقید کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسے ماحول میں مولانا عبید اللہ سندھی کا کھل کر مسلمانوں کو انگریزی سیکھنے کی طرف مائل کرنا اوراسے عصر حاضر کا اہم تقاضہ قرار دینا ایک بہت ہی احسن اور انقلابی اقدم تھا۔ آپ نے خاص طور پہ عربی مدارس کے نوجوانوں کو انگریزی سیکھنے کی ترغیب دی اوران کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا ضرور مطالعہ کریں آپ کا کہنا تھا ''عربی دان طالب علم کی انگریزی زبان کی تحصیل کرنی

چاہئے“(9)

مذہبی مدارس کے نوجوانوں کو انگریزی سیکھنے اور سکھانے کی طرف متوجہ کرنا وہ بھی ایک ایسے ماحول میں جہاں عام معاشرے میں رہنے والے مسلمان بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے یقیناً ایک بہت بڑی بات تھی۔ آپ نے اس فرسودہ ذہنیت کو ختم کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں زوال پذیر تھے۔ آپ نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی جس کا مقصد پورے ملک میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ایک جمہوری سیاسی تبدیلی لانا تھا اس کے پروگرام کے **نکتہ نمبر ۹ میں درج کرتے ہیں کہ:** ہند کے دوسرے حصوں سے ملنے کے لئے جہاں اردو بین الاقوامی فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان ممالک ہند کے لئے پارٹی انگریزی زبان کو اپنی انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(ا) اور اس طرح بیرونی ممالک کے لئے بھی اسے اپنی بین الاقوامی زبان بناتی ہے۔

تشریح: انگریزی زبان تخمیناً دو سو برس میں بالتدریج حکومت کر رہی ہے۔ جنوبی ہند کے بعض حصے اسے اپنی زبان کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اسے نیم ہندوستانی زبان کا درجہ دینا انصافاً و مصلحتاً ضروری ہے۔

(ب) پارٹی کے حلقہ اثر میں انگریزی زبان کی تعلیم ہر فرد کے لئے حسب المدارج ضروری ہے۔

تشریح: سندھ ساگر پارٹی اپنے پہلے دور میں مصلحت خارجیہ کے لئے انگریزی کو اول درجہ پر رکھے گی اور اردو، ہندوستانی کو دوسرے درجہ پر اس کے بعد دوسرے دور میں اردو ہندوستانی کو اول درجے پر رکھے گی اور انگریزی کو دوسرے درجے پر۔ مگر انگریزی کو اپنے حلقہ اثر سے نہ تو

خارج کرے گی، نہ اس کی اہمیت کم کرے گی"۔(10)

مندرجہ بالا نکات سے انگریزی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، انگریزی زبان کو اس قدر اہمیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلابات سے استفادہ کرنے عالمی سطح پہ قوموں کے ساتھ اپنے سیاسی ومعاشی روابط کو استوار کرنے کے لئے انگریزی کو سیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا، مگر آج انگریزی کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ چکی ہے، آج دنیا کی عالمی رابطے کی زبان انگریزی ہے، دنیا بھر کے انفارمیشن ٹیکنالوجی ہو یا میڈیا کے جملہ ذرائع، یا جدید یورپ اور امریکہ کے زندگی کے ہر شعبے سے متعلقہ تحقیقی مقالات جات وایجادات کے علمی خزانوں سے استفادہ کرنا ہو تو انگریزی سیکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وہ مشرقی اقوام جنہوں نے اپنی زبانوں کو ترقی دی انہوں نے بھی سائنسی علوم کی بنیادیں کھڑی کرنے کے لئے انگریزی ہی کو بنیاد بنایا اور اپنے تعلیمی نظاموں میں اس کو اہم حیثیت دے رکھی ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنی قومی زبانوں کو نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ تخلیق وایجاد کی قومی صلاحیت کو جلا بخشنے کے لئے اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اور اس حوالے سے مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے سیاسی پروگراموں میں مقامی زبانوں کی اہمیت بھی بیان کی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی جہاں اہل علم طبقات کو یورپ کے علوم سیکھنے کے حوالے سے انگریزی زبان سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں وہاں وہ معاشرے کے عام افراد کے لئے بھی اسے سیکھنے پہ زور دیتے ہیں اس حوالے سے ان کا کہنا تھا: "ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں، اور اپنے خاندان کے کسی فرد کو عام اس سے کہ عورت ہو یا مرد ایسا نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی زبان یورپین حروف میں

نہ لکھ سکتا ہو۔"(11)

مولانا عبید اللہ سندھی انگریزی سیکھنے کی تعلیم فقط اس لئے دے رہے ہیں کہ مسلمان نوجوان یورپ سے نمودار ہونے والی اس علمی تحریک سے جڑ کر اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کریں اور اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا سیکھیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی برکات سے اپنی قوم کو مستفید کر سکیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے کہ یورپ سے اٹھنے والی علمی اور سائنسی تحریک نے جو انقلابات شروع کر دیئے ہیں عنقریب پوری دنیا کی اقوام اس کے اثر میں آنے والی ہیں لہذا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان معاشرے اس تحریک سے استفادہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، اگر وہ اس تحریک سے مستفید ہو کر اپنی قومی نظاموں کی تعمیر نو نہیں کرتے تو وہ انقلابات ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے ان کا کہنا تھا "ہندوستان کو ایک نہ ایک دن سیاست، اور معیشت کے متعلق یورپی نظریات کو قبول کرنا ہی ہوگا، یہ مشینی دور اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔"(12) مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"آج جو کچھ یورپ کی جمہوریت پسند قوموں کو پیش آ رہا ہے کل یا پرسوں ہمیں بھی اس کا سامنا کرنا ہوگا اس لئے دانشمندی اور تدبر کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ابھی سے اس کے لئے تیار ہو جائیں۔"(13)

آپ نے جب نوجوانوں کی تربیت کے لئے محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج اور سوسائٹی کی تشکیل کے لئے جو اساسی اصول متعین کئے ان میں بھی اس عصری حقیقت کو واضح طور پہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ "محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی سائنس کی ترقی میں یورپ کو اپنا مرکز قبول کرتی ہے"(14)

یہاں کس قدر واضح انداز سے یورپ کو سائنسی ترقی کے حوالے سے علمی مرکز کے طور پہ

قبول کیا گیا ہے، اس کی اگر مزید وضاحت کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے، نظریہ تعلیم، نظام تعلیم، طریقہ تعلیم اور ان کے سلیبس وغیرہ سے مکمل ہم آہنگی اور تسلسل موجود ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک یورپ کے تعلیمی و تحقیقی اداروں میں داخلے اور وہاں قیام کو یقینی نہ بنایا جا سکے یا ان کی طرز پہ ایسے ادارے اپنے ملک میں قائم نہ کئے جائیں، جہاں یورپ یا امریکہ سے تعلیم یافتہ ماہر اساتذہ سے تعلیم و تربیت کے لئے موجود ہوں۔ دیگر مذہبی علماء کے مقابلے میں مولانا عبید اللہ سندھی نے مسلمان نوجوانوں کو یورپ سے متنفر کرنے کی بجائے انہیں جدید علوم اور ٹیکنالوجی کو سیکھنے اور اسے اپنانے کی دعوت دی آپ کا کہنا تھا ”ہمیں یورپ سے سیکھنا ضروری ہے ہمارے پرانے ہتھیار اس زمانے میں کسی کام کے نہیں رہے“(15)

مولانا عبید اللہ سندھی مسلمان معاشروں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”جس طرح ہم نے یورپ سے تنفر برت کر اپنی ترقی کو محدود کر لیا ہے اسے خیر باد کہیں“(16)

آج بھی اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس امر کی حقیقت کئی گنا بڑھ چکی ہے، اب امریکہ اور یورپ دونوں علمی و سائنسی میدانوں کے سرخیل ہیں، ان کے تعلیمی و سائنسی اداروں سے تربیت حاصل کر کے اپنے ملکی نظام کو ترقی دینا اور خود کفالت حاصل کرنے کی آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اس وقت ہم بحیثیت قوم ایک انتہائی فرسودہ سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام کے تعفن سے تباہی و بربادی کے گڑھوں میں گرنے کی طرف رواں دواں ہیں، قوم کا اسی فیصد طبقہ جاہل اور ان پڑھ ہے، کروڑوں بچے سکول نہیں جا سکتے، تعلیمی نظام کی پستی اس قدر ہے کہ آج تک کوئی واضح نصاب متعین نہ ہوسکا، ہماری یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول، دنیا کے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج بھی لگتا ہے مولانا

عبید اللہ سندھی اسی معاشرے میں کھڑے ہیں اور نوحہ کناں ہیں ہماری حالت پہ اور اس ذلت سے نکلنے کی صدائیں دے رہے ہیں۔

بدقسمتی سے مولانا عبید اللہ سندھی کی اس ترقی پسند آواز کو رجعت پسند طبقات کی طرف سے دبانے کی روایتی کوششیں کی گئیں بجائے اس کے ان کی باتوں پہ غور کیا جاتا الٹا ان پہ طرح طرح کے الزام لگا کر، ان کی فکر کو نوجوانوں تک پہنچنے سے روکا گیا، رجعت پسند طبقے کی طرف سے تنقید پہ اپنی وضاحت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''ہم نظریات تو وہی مانتے ہیں جو امام ولی اللہ دہلوی سے لے کر شیخ الہند تک ہمارے بزرگوں نے مقرر کیے لیکن آج کے دور انقلاب میں ان مقاصد عالیہ کو حاصل کرنے کے لئے پروگرام ہم یورپ سے سیکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس لئے ہم نوجوانوں کو اپنے علمی نظریات کے ساتھ عملی تجارب سکھانے کے لئے انہیں یورپین بننے کی دعوت دیتے ہیں'' (17)

شاید یہ مصلحت وقت کا تقاضہ تھا کہ آپ کو بار بار یہ وضاحت کرنی پڑتی تھی کہ وہ ان تمام بزرگوں کی تعلیمات و نظریات ہی کہ پیروکار ہیں جن کو مذہبی طبقات مانتے ہیں، لہذا وہ ان کو مطمئن کرنے کے لئے اور اس پروپیگنڈے کو کم کرنے کے لئے اس طرح کی وضاحتیں پیش کرتے تھے۔یقیناً وہ ان تمام بزرگوں کے افکار ہی کے پیروکار تھے لیکن انہوں نے اپنی تحریروں اور خطبات میں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے کہ اس نئے دور کا آغاز وہ اپنی فکر سے کرنا چاہتے ہیں، بے شک گذشتہ بزرگوں کے نظریات مقدم ہیں لیکن جس طرح وہ ان بزرگوں کے فکر کو سمجھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھتا، وہ اکثر یہ کہتے تھے کہ یورپ سے استفادہ دراصل ان بزرگوں ہی کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

آپ کو بے حد قلق تھا کہ خاص طور پہ مذہبی طبقہ ان کی باتوں پہ دھیان نہیں دیتا اور ان پہ

بلا سوچے سمجھے تنقید کرتا ہے، اس حوالے سے آپ کے شاگرد رشید پروفیسر سرور لکھتے ہیں

''کبھی کبھی مولانا سندھی اچھے موڈ میں ہوتے اور خود اپنے اوپر ہنسنے کو ان کا جی چاہتا تو مسکراتے ہوئے فرماتے کہ ہجرت سے پہلے جب میں یہاں تھا اور پڑھتا پڑھاتا ،لکھتا لکھاتا اور اپنی باتیں لوگوں سے کہتا تھا تو مجھے بہت بڑا عالم سمجھا جاتا تھا اور بعض خوش عقیدہ لوگ یہاں تک کہہ دیتے کہ یہ ابن تیمیہ ہوگا لیکن اب جو میں ملک سے باہر گیا ہوں دنیا دیکھی ہے بہت کچھ حاصل کیا ہے پرانی سلطنتوں کو ٹوٹتے اور نئی سلطنتوں کو بنتے دیکھ آیا ہوں ،دیکھا ہے کہ پرانے دستور جا رہے ہیں اور ان کی جگہ نئے دستور آ رہے ہیں اور یہ کہ کل جو کچھ روس اور ترکی میں ہوا آج یہی عمل دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے اور آئندہ کل کو ہماری باری ہو گی ،اب جو اہل وطن کو میں اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر کچھ کہتا ہوں تو کہتے ہیں اب کہ عبید اللہ کا دماغ چل گیا ہے وہ پاگل ہو گیا ہے وہ واہی تباہی بکتا ہے وہ مرفوع القلم ہے۔''(18)

مولانا عبید اللہ سندھی کی اس انقلابی فکر کی دعوت کے اصل مخاطب نوجوان ہیں، وہ ہمیشہ نئی نسل کو ہی تبدیلی کے لئے ہراول دستہ سمجھتے تھے، چونکہ پرانی نسل جو کہ اپنا ایک وقت گذار چکی تھی اور اپنے اس پرانے نظام فکر سے چمٹے ہوئی تھی اور اسے کسی بھی صورت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی اور جب بھی کوئی عصری تقاضوں کی بات ہوتی تو وہ اسے بلا تحقیق رد کر دیتے تھے، اور اسے خلاف تقلید قرار دے کر ملعون قرار دیتے تھے۔ایسے رفقاء کے بارے میں مولانا عبید اللہ سندھی نے بہت دلچسپ انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا

''ہمارے پرانے رفقاء میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوں ان کی خدمت میں مختصراً عرض ہے

کیسے تیر انداز ہو، سیدھا تو کر لو تیر کو

ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے

نصیحت گوش کن جانا کہ از جاں دمت تر دارند　　　جوانان سعادت مند پند پیر دانا۔"

(ترجمہ۔میرے پیارے دوست میری نصیحت کو کان لگا کر (غور سے سن، سعادت مند نوجوان بوڑھے عقلمند کی نصیحت کو غور سے سنا کرتے ہیں۔"(19)

طرح طرح کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مولانا عبید اللہ سندھی کی مسلسل لگن اور جدو جہد ان کی اپنے نظریئے پہ کامل یقین کی عکاسی کرتی ہے تو دوسری طرف ایک سچے اور باعمل انسان ہونے کا ثبوت بھی ہے۔

باب دوم

جمہوری نظام فکر وقت کا اولین تقاضہ

جمہوری دور کا آغاز اور اس کی اہمیت

مولانا عبید اللہ سندھی دورِ جدید کی جس فکر کے علمبردار تھے اس کی بنیاد انسان کی عقلی قوتوں کی آبیاری، اور یورپ کی علمی و سیاسی تحریکوں کا مطالعہ تھا، گذشتہ صفحات میں ان کے نظریات کا اس حوالے سے تجزیہ کیا گیا، آئندہ صفحات میں یورپ سے نمودار ہونے والے سیاسی تحریک جس کی اساس ''جمہوریت یا لبرل ازم'' ہے پہ مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار کا تجزیہ کیا جائے گا۔

انسانی ارتقاء کی تاریخ بتاتی ہے کہ جنگلوں اور غاروں میں بھٹکتا ہوا انسان اس زندگی پہ قانع نہیں ہوا، بلکہ اپنی عقلی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فطرت کے اسرار و رموز کو جاننے اور پہچاننے کی تگ و دو میں ہمہ وقت مصروف عمل رہا، اس شکاریاتی دور میں فطرت کی قوتوں سے نبرد انسان نے کافی مشقتیں اٹھائیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے کوششیں جاری رکھیں، تمام لوازم زندگی، رہن، سہن، کھانا پینا، خاندانی تعلقات وغیرہ کے حوالے سے نئے نئے طریقے اور انداز سوچنا شروع کئے، اس طرح انسان نے اپنی کوششوں سے اپنے گرد و پیش میں تبدیلی کی اگلی منزل تک رسائی

حاصل کی، زرعی دور کا آغاز ہوا انسان نے نئے خاندانی نظام کی داغ بیل ڈالی، قبائلی نظام زیادہ مضبوط ہوا، تجارت، جنگ و جدل اور باہمی تعلقات کی نئی نوعتیں وجود میں آئیں، انسانی عقلی قوتوں کی کرشمہ سازی کا یہ سفر مسلسل چلتا رہا، زمانے گذرتے رہے، قبائلی نظاموں کے بعد ریاستی نظاموں کا دور آیا، انسان نے شہر آباد کئے، ریاستوں کے اصول و ضوابط بنائے، ریاستوں کے درمیان تعلقات اور معاہدات کی نئی نوعیتیں سامنے آئیں، جنگی ساز وسامان، کھانا پینا، شادی بیاہ، مذہب، اخلاق، قانون کے نئے معیار ایجاد کئے گئے، انسانیت کا یہ قافلہ تہذیبوں کو پروان چڑھاتا ہوا، ایک سے دوسرے دور میں داخل ہوتا چلا گیا، زرعی دور اپنے عروج کو پہنچا، اسی طرح تہذیبیں وجود میں آتیں اور اپنا وقت پورا کرتی اور فنا ہوتی رہیں اور ان کی جگہ نئی اور جاندار تہذیبیں وجود میں آتی چلی گئیں، انسانی عقل نے مزید کرشمے دکھانے شروع کئے، علوم وفنون کی تخلیق کا ایک نیا دور شروع ہوا، جس سے سائنس نے جنم لیا اور انسانیت کا یہ قافلہ صنعتی دور میں داخل ہوا۔ سائنس کی تخلیق نے انسانی معاشروں کو نئے انقلابات کی طرف گامزن کر دیا، فطرت کے سربستہ رازوں تک رسائی مزید آسان ہونے لگی، ٹیکنالوجی نے تحقیق وجستجو کے عمل کو سبک رفتار بنادیا، ٹیکنالوجی نے معاشروں کے ڈھانچوں کو یکسر تبدیلی سے دوچار کر دیا، انسانی تعلقات کی نوعتیں ہوں، آبادیوں کا نظام ہو یا تجارت کے انداز، خاندانی نظام ہو یا ریاستی نظام، ہر پہلو سے انسانی معاشروں کی کایہ پلٹنی لگی، اب اقوام کی طاقت اور ترقی کا راز سائنس اور ٹیکنالوجی کی طاقت میں مضمر ہو گیا، قومیں ایک دوسرے پہ سبقت حاصل کرنے کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کو اپنے اندر رائج کرنے میں جت گئیں۔۔۔۔تاریخ کا یہ سارا عمل انسانیت کے اس فطری ارتقاء کے ایک ناگزیر عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ جسے اختیار کئے بغیر قومیں اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ارتقاء کے اس فطری تسلسل میں آڑے آنے والی ہر قوم،

ہر نظریہ، ہر قانون اور ہر مذہب واخلاق کا نظام بے معنی ہوتے چلے گئے۔

صدیوں پہ محیط انسانیت کے اس سفر کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ہر دور کے تقاضے دوسرے دور سے مختلف ہوتے چلے جاتے ہیں،قوموں کے عروج وزوال کا عمل ان ہی عصری تقاضوں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔جب انسانی کاوشوں کا یہ سفر بیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوا تو سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی نے فکر وفلسفہ،فنون لطیفہ،قوانین ومعاہدات، سیاسی وحکومتی نظام ، سماجی تعلقات،خاندانی نظام،انفرادی و اجتماعی اخلاقی نظام،تجارت ومعیشت ، کے نئے معیاروں نے زمین وآسمان بدلنا شروع کردیئے۔ٹیکنالوجی کی اختراع نے گذشتہ تمام فلسفوں پہ پانی پھیر دیا،صنعت وحرفت اور معلومات کے تبادلے کے میدانوں میں ایسے انقلابات پیدا ہونا شروع ہوئے انسانی دنیا''ایک گاؤں''میں تبدیل ہوکی طرف گامزن ہوگئی

اقوام نے اپنے فرسودہ ہونے والے افکار ونظریات،حکومتی وسیاسی نظاموں کو خیر آباد کہنا شروع کیا،انسانی معاشرے کو ارتقاء کی اگلی منزل سے ہمکنار کرنے والا مرکز''یورپ'' میں بنا۔علوم اور مشین کی طاقت سے یورپی اقوام نے پوری دنیا کو سر کیا، جدید علوم اور فکر سے بے بہرہ اقوام ان عصری تقاضوں کی روگردانی کی سزا معیشتوں کی لوٹ کھسوٹ اور غلامی کی صورت میں بھگتتی رہیں،اس طرح یورپین اقوام نے مینوفیکچرنگ کلچر سے اور جدید معاشی نظام کی مدد سے اقوام کی تجارتی منڈیوں کو اپنے کنٹرول میں کرلیا،اب ان یورپی اقوام جن کو سائنس اور ٹیکنالوجی کا بانی قرار دیا جاتا ہے،ان کا مقابلہ اب سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان کو سر کیئے بغیر نہیں ہوسکتا۔معاشی وسیاسی غلامی ان کا اقوام کا مقدر ٹھہرے گی جو اس میدان میں غفلت کا شکار رہیں گی۔

انسانی ارتقاء کے ان تقاضوں کو مولانا عبیداللہ سندھی نے سمجھا اور اس کے مطابق

خودکو بدلنےاور نئے نظاموں میں ڈھلنے کامشورہ دیا،یورپ سے اٹھنی والی اس سیاسی تحریک کو اوراس کے در پردہ کارفرما فلسفوں کا مطالعہ کرنے اور انہیں سمجھنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔"میں کہتا ہوں پہلے یورپ کی سیاست کو سمجھو"(20)مزید فرماتے ہیں"اب دنیا کا سیاسی مرکز یورپ منتقل ہو چکا ہے۔"(21)

مولانا عبید اللہ سندھی یورپ سے اٹھنے والی بیسویں صدی کی سیاسی جمہوری تحریک کے اثرات کے تناظر میں اسلامی دنیا کا تجزیہ کرتے ہوئے سمجھاتے ہیں کہ کس طرح عصری تقاضوں سے غفلت کی وجہ سے مسلمان معاشرے سیاسی طور پہ روبہ زوال ہوئے،اور کس طرح انہوں نے"جمہوریت" کی بجائے"شاہیت"یعنی"آمریت" کواوڑھنا بچھونا بنائے رکھااور نقصان اٹھایا،آپ فرماتے ہیں:

"اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھااس دور میں زمام اقتدار کلیۃً غیر عرب مسلمان اقوام کے ہاتھ میں آ گئی اور خود عرب قوم اوران کا ملک تک عثمانی ترکوں کے ماتحت ہو گیا۔ان مسلمان اقوام پر ان کے قومی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندے نہ تھے کہ ان کے عزل ونصب کا اختیار جمہور کو ہوتا۔یہ تلوار کے زور سے تخت وتاج کے مالک بنتے تھےاور جوان میں سے صالح ہوتا۔وہ البتہ جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا۔آہستہ آہستہ حکمراں بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئےاور آخر کار"شاہیت"اپنے محکوموں کے لئے وبال جان بن گئی۔بدقسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان "بادشاہوں" کو جواب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے مسند اقتدار سے الگ کر کے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔اور دنیائے اسلام میں قومی شاہی حکومتوں کے بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہو کر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کر دیا،یاانہیں اپنی مرضی کے تابع بنالیا۔لیکن مسلمان

جمہور خواب غفلت میں پڑے سوئے رہے اور اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی ہوئی تو مستبد بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بار آور ہونے نہ دیا۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ ''شاہیت'' کے اس دور میں کم وبیش ایک ہی زمانے میں ہر اسلامی ملک میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جن کے مخاطب جمہور تھے یہ تحریکیں قومی اور جمہوری تھیں۔ان کے بانیوں کے پیش نظر ساری دنیائے اسلام نہ تھی۔ بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے۔عثمانی ترکیوں کے ہاں اس تحریک نے تنظیمات کی شکل اختیار کی۔عربوں میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے۔شمالی افریقہ میں امیر عبدالقادر نے قوم کی زمام قیادت سنبھالی۔مصر میں خدیو محمد علی اہل مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے۔ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا۔شاہ ولی اللہ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظّم کرنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ان تحریکوں کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو قریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے،مشرقی ملکوں پر پل پڑے اور بجائے اس کے کہ قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمنٹری حکومتیں بنتیں، یورپ والے بیچ میں آ گئے اور تمام اسلامی دنیا ان کی ترکتازیوں سے تہ وبالا ہو گئی۔''(22)

مولانا عبید اللہ سندھی نے جب اپنے سیاسی تجربات کے ذریعے دور جدید کے تقاضوں سے آگاہی حاصل کی تو انہوں نے اپنے فکر کو ان نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا،اپنے ایک ناقد مولانا مسعود عالم ندوی کے نام خط میں اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں''ہماری سیاست میں ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہمارا سیاسی فکر بدل گیا،اسے ہم نہیں چھپاتے کاش ہمارے دوست ہم سے اسباب انقلاب بھی سن سکتے۔''(23)

مولانا عبید اللہ سندھی یورپ کے سیاسی طرز حکومت کو ہی اب مستقبل میں کامیابی کا

ذریعہ سمجھتے تھے، لہذا اس کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں

''اب یورپین طریقے کے نظام حکومت پر کامیابی ہو سکے گی، افغانستان، ٹرکی، عربی ممالک سب کے سب یورپین طریقے پر اپنی حکومتوں کی تجدید کر رہے ہیں۔''(24)

یہاں مولانا عبیداللہ سندھی کا اشارہ نظام جمہوریت سے ہے، جو کہ اس نئے دور کا اہم ترین تقاضہ ہے، آپ یہ چاہتے تھے کہ نوجوان پہلے یورپ کے علوم کو سمجھیں اور پھر ان کے نظاموں اور معاشروں میں برپا ہونے والے انقلابات کا شعوری مطالعہ کریں اور جمہوریت کو نظام حکومت کے طور پہ اپنائیں۔ ''جمہوریت'' کے بارے میں مروجہ لٹریچر اور اس سے دنیا میں قائم حقیقی جمہوری سیاسی نظام سے پیدا شدہ معاشرے اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ صرف ایک سیاسی طرز حکومت کا ہی نام نہیں بلکہ ایک ایسی سوچ، مزاج اور رویہ کا نام ہے جس کے تحت انسانوں کی دنیا میں ایسا ماحول پیدا ہوتا ہے جس سے ہر انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس معاشرے میں زندوں میں شمار ہوتا ہے اس کی رائے کا احترام موجود ہے، اس کے احساسات وجذبات کی قدر دانی ہوتی ہے، اس کے حقوق کی حفاظت کا مؤثر انتظام موجود ہے، وہ بحیثیت شہری، بحیثیت انسان اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے اور خوشی سے گذارنے کا حق رکھتا ہے۔ جمہوریت کے یہ سارے ثمرات دراصل اس لئے ظاہر ہوتے ہیں کہ یہ انسان کے ''آزادی اظہار رائے'' کو زیر بحث لاتی ہے، اور اس کے احترام کو معاشرے میں یقینی بنانے کا اہتمام کرتی ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں ''آزادی اظہار رائے'' کو اگر اس سے نکال دیا جائے تو پھر یہی جمہوریت ''آمریت میں بدل جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی جمہوری رویوں کی اساس ''آزادی اظہار رائے'' کو قرار دیتے ہیں، اگر کسی معاشرے میں انسان کی رائے کا احترام موجود نہیں تو کبھی بھی جمہوری

رویئے پروان نہیں چڑھ سکتے، آپ فرماتے ہیں:

’’جس فیصلے میں میری رائے کو دخل نہیں، وہ فیصلہ میرے لئے ذلت آمیز ہے وہ بات جو مجھ سے بغیر مجھے قائل کرائے منوائی جائے، وہ میری ذات کی توہین ہے انسان کا اولین حق یہ ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ اور اس سے مراد ہے اس کی رائے کا مستقل ماننا۔ انسان کی رائے ہی اس کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔‘‘(25)

جمہوریت یا آزادی اظہار رائے وہاں پروش نہیں پا سکتے جہاں آمرانہ طرز فکر موجود ہو، مولانا عبیداللہ سندھی اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں معاشرے میں جمہوریت کی بجائے شاہ پرستی موجود تھی جہاں فرد کی رائے کے احترام کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں:

’’میری قوم کے دماغ میں شاہ پرستی گھسی ہوئی ہے۔ ہمارا مذہب ہمارے علوم وافکار ہمارا سماج، ہماری سیاست غرض ہماری پوری زندگی شاہ پرستی سے متاثر ہے۔ بے شک اب ہمارے ہاں بادشاہ نہیں رہے لیکن ہماری شاہ پرست ذہنیت نے ان کی جگہ نوابوں، راجاؤں، پیروں، بزرگوں استادوں یہاں تک کے سیاسی لیڈروں کو بادشاہ بنالیا ہے۔‘‘(26)

یہاں ’’شاہ پرستی‘‘ اور ’’خلیفہ پرستی‘‘ سے مراد ایسا ماحول ہے جہاں کسی فرد واحد کو مقدس حیثیت دے دی جائے اور کوئی بھی فرد یا ادارہ اس کی بات سے اختلاف رائے کرنے کی جرات نہ کر سکے، اور ہر حال میں اس کے درست یا غلط حکم اور رائے کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا پابند ہو جائے۔ اور اس کی رائے پہ تنقید یا اس پہ سوال اٹھانے والا قابل تعزیر اور مذمت سمجھا جائے۔ اور ایک طرح کی شخصی آمریت پیدا ہو جائے۔ مولانا عبیداللہ سندھی ایسی آمرانہ روش کو آزادی اظہار رائے کے منافی سمجھتے تھے، کیونکہ اس سے آمرانہ رویئے جنم

لیتے ہیں،اس شاہ پرستی یا آمریت سے نکلنے کا واحد حل یہ بتاتے ہیں کہ جمہوری نظام کو اختیار کرنے کی جدوجہد کی جائے لہذا اس مقصد کے لئے وہ یورپی جمہوری نظام سے استفادہ کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ اس نظام میں ''ووٹ'' اصل طاقت ہے اور اظہار رائے کا زریعہ بھی۔ جب افراد معاشرہ ووٹ کی طاقت کا آزادانہ استعمال کریں یا انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہو تو وہاں آمریت جگہ نہیں پا سکتی، یہی وہ طریقہ ہے جس سے مسلمان معاشروں میں مروجہ'' آمرانہ ذہنیت'' سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔اس پہلو پہ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''مسلمان یورپین ازم کو اختیار کئے بغیر شاہ پرستی کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔ یورپینزم کا پہلا اثر تو یہ ہوگا کہ لوگ ووٹ کی حکومت کی اہمیت کو سمجھیں گے، ووٹ کے معنی یہ ہیں کہ جس کو میں اپنا ووٹ دوں، وہی میرا حاکم ہوگا، یعنی حکومت کسی شاہی خاندان کی نہیں جو پہلے سے چلا آتا ہے۔ بلکہ ووٹ ڈالنے والے کی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ میری قوم جلد سے جلد یورپینزم کو اپنائے تا کہ وہ شاہ پرستی کی اس دلدل سے نکل سکے۔شاہ پرستی کی ذہنیت کو چھوڑے بغیر قوم کی ترقی ممکن نہیں۔''(27)

مولانا عبیداللہ سندھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو بھی جمہوری نظام کا ثمرہ قرار دیتے ہیں اور مسلمان معاشروں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں زوال کی وجہ آمریت یعنی'' شاہ پرستی'' کو قرار دیتے ہیں جس کی وجہ سے تمام تحقیق و تخلیق کے سلسلے جمود کا شکار ہو چکے ہیں،اور اس زوال سے نکلنے کے لئے نئے سماج کی تشکیل کا نظریہ دیتے ہیں جہاں جمہوری سیاسی نظام کی آغوش میں زندگی کے تمام شعبہ جات ترقی سے ہمکنار ہو سکیں،آپ

انتہائی دردمندی سے فرماتے ہیں:

''جب مَیں انجن اور ہوائی جہاز کو دیکھتا ہوں تو یہ جان کر کہ میری قوم نے اس کو نہیں بنایا، میرے اندر آگ لگ جاتی ہے، جو قوم ہوائی جہاز اور انجن سے غافل ہے وہ قوم مردہ ہے، بے جان ہے۔ جب تک ہم اپنے شاہ پرستانہ سماج کو جو اب فرسودہ ہو چکا ہے ختم نہیں کریں گے اور یورپین انداز پر اس کی تعمیر نو نہیں کریں گے ہمارا کوئی مستقبل نہیں، یہ دور مشین کا ہے۔اور مشین کے لئے نیا سماج چاہئے، پرانا سماج اور نئی مشین ایک ساتھ نہیں رہ سکتے''۔(28)

مولانا عبیداللہ سندھی مسلمانوں سے التجا کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''میں آپ سے عاجزانہ التجا کرتا ہوں کہ پرانے شاہی دور کی واپسی سے مایوس ہوجایئے''(29)

یہاں مولانا عبیداللہ سندھی جمہوریت اور مشین کا آپس میں تعلق بھی بیان کرتے ہیں۔دراصل تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مشین کی ایجاد نے ہی جمہوریت کو جنم دیا، جو معاشرے ٹیکنالوجی میں آگے بڑھیں گے وہاں لامحالہ جمہوری نظام تقویت پائیں گے، لہٰذا یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، ٹیکنالوجی کی ترقی اور جمہوری نظام کا قیام ہی فی زمانہ قومی ترقی کے لئے اہم ترین حکمت عملی ہونی چاہئے۔

مولانا عبیداللہ سندھی سیاسی نظاموں کے حوالے سے ''جمہوریت'' کو اساسی حیثیت دیتے ہیں اور تمام مسلمان خواص اور عوام کو آمرانہ اور شاہی اندازفکر کی بجائے جمہوری اندازفکر کو اپنانے پہ زور دیتے ہیں اور اسے عصر حاضر میں قوموں کی تشکیل کے لئے انتہائی ضروری قرار

دیتے ہیں ۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے صنعتی انقلاب نے نیشنلزم، سیکولر ازم، جمہوریت اور سوشلزم کوجنم دیا ہے۔ان کا کہنا تھا:

''یورپ میں دوتحریکیں کارفرماہیں،لبرل ازم اور مکینکل ازم پہلی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے اکثر ممالک جمہوریہ بن گئے۔حکومت بادشاہ کے نام سے ہو یا منتخب رئیس کے نام سے بہرصورت ملک کے اہل آراء پارلیمنٹ کے مشورہ سے کام ہورہا ہے۔اس طرز حکومت میں برطانیہ یورپ کے لئے استاد کا کام کرتارہا ہے۔''(30)

حقیقی جمہوریت ایسی سیاسی مساوات کا نام ہے جہاں بلا رنگ ونسل ومذہب تمام مرد اورخواتین کوحکومت کی تشکیل میں اپنی اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہو،جمہوری نظام حکومت کی تشکیل کے لئے معاشرے میں ہرسطح پہ جمہوری رویوں کوفروغ دینا پڑتا ہے۔تمام عوامی طبقات ان جمہوری رویوں کی بدولت اپنے اندر اجتماعیت پیدا کرتے ہیں،مختلف سطحوں پہ چھوٹی جماعتیں تشکیل دے کر اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے ہیں،انتخابی عمل سے گذر کر اپنے حقیقی نمائندوں کوقانون ساز اداروں میں پہنچاتے ہیں تاکہ ملک میں ایسی قانون سازی ہوجس سے ان کے حقوق کوتحفظ حاصل ہوسکے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے جمہوریت کی حقیقت اوراس کے انسانی معاشروں پہ اثرات کا تجزیہ کیا اوراس حقیقت کا ادراک کرلیا کہ اب آنے والا دور جمہوری دور ہوگا، کیونکہ مشین کی ایجاد نے مروجہ جمہوری نظاموں کوجنم دیا ہے،جب مشین آئی تو کارخانے اورملیں لگنی شروع ہوگئیں۔انسان کھیت مزدور سے صنعتی مزدور بن گئے۔فیکٹریوں کا کنٹرول زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔جوانہیں استحصال کا شکار کرنے لگے۔لیکن مشینوں پہ اجتماعی کام کرنے

سے مزدوروں میں ایک طرح کی تنظیم پیدا ہوگئی۔اور اپنے مسائل کو وہ مل جل کر حل کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اس طرح انہوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لئے ٹریڈ یونینز کا آغاز کیا۔ٹریڈ یونینز دراصل ایسے اجتماعات ہیں جنہوں نے مزدوروں کو جمہوری عمل میں شریک کر دیا۔دور جدید کے اس تقاضے پہ روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی کا کہنا تھا کہ:

''انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے۔اس مشین سے صنعت وحرفت کا دور شروع ہوتا ہے۔بیشک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لایا اور مشینوں کو چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے،لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظّم ہورہے ہیں اور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے''۔(31)

چونکہ مشین کے آنے سے مزدوروں اور کاشتکاروں کو اپنے حقوق کے لئے اکٹھے ہونے کا موقع ملا،لیکن جب تک وہ منظّم نہ ہوں اور ان میں آپس میں کامل یکجہتی نہ ہو وہ اپنے حقوق کے حصول میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے ہیں،اس پہلو پہ روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی بیان کرتے ہیں:

''مشین کا خاصہ ہے کہ وہ تمام کاریگروں کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے منظّم کر دیتی ہے ایک مشین کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی ایک جماعت جب تک ایسی نہ ہو جائے گویا وہ ایک فرد واحد ہے،اس وقت تک کسی کاریگر کو روٹی کا ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔''(32)

مزید بیان کرتے ہیں

''یورپ کی ترقی دراصل مکنیکل ازم میں ہے یورپین اقوام نے چھوٹے بڑے کام کے لئے اس قدر مشینیں بنائی ہیں کہ مشرقی ممالک اس کے مقابلے سے عاجز آ گئے ظاہر ہے کہ مشینیں کاریگروں کے سوا کام نہیں کرتیں ان کاریگروں کو یورپ میں مزدور کہا جاتا ہے آپ انہیں اپنے ملک کے ناتربیت یافتہ مزدور نہ سمجھ لیجئے گا، اس مزدور جماعت کا ایک نمائندہ برٹش ایمپائر کا پرائم منسٹر رہ چکا ہے۔''(33)

مولانا عبید اللہ سندھی نوجوان نسل کو قوم کا سرمایہ سمجھتے تھے اور ان کی حقیقی جمہوری بنیادوں پہ سیاسی تربیت کو انتہائی اہم سمجھتے تھے، وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ہندوستان کی تاریخ کا شعوری طور پہ مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور'' مشین اور جمہوریت'' کی اہمیت اور اس کے ثمرات کو سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ نوجوان نسل کو مخاطب کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''ہمارے نوجوان اگر دنیا کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو انہیں اس معاملے میں برطانیہ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ہم نے اپنی سیاحت میں دیکھا کہ ترک، ایرانی، افغانی اور عرب اپنے ممالک میں جمہوریت اور مشین کو ترقی دے رہے ہیں۔''(34)

عبیداللہ سندھی جمہوریت ہی کو جمہور کی طاقت کے استعمال کا ذریعہ مانتے تھے، اور وہ یہ جان چکے تھے کہ دور جدید میں جمہوری نظام کے بغیر تمدنی ترقی کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ کیونکہ جمہوری معاشروں میں علمی، فکری، اور تمدنی ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ کیونکہ''

جمہوریت کا ارتقاء انسانی حقوق کے فروغ سے وابستہ ہے اور انسانی حقوق کا فروغ وسائل معاش کے فروغ سے وابستہ ہے۔"(35)

برطانیہ میں مروجہ جمہوریت کا آغاز ہوا۔اور برطانیہ کی پارلیمان مادر پارلیمان بن گئی۔اور جہاں جہاں برطانیہ کی حکمرانی ہوئی انہوں نے جمہوریت کو وہاں فروغ دینے کی کوشش کی۔اگرچہ انہوں نے کمپنیوں کے سرمائے کے زریعے مختلف اقوام کو لوٹا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ دو چیزیں ان معاشروں کو ضرور میسر آئیں نمبر ایک جدید خطوط پہ تعلیم کا نظام جس سے جدید جمہوری سوچ پیدا ہوئی،اور دوسرا ٹیکنالوجی کا تعارف چاہے اس کا تعلق سول سے ہو یا فوجی ٹیکنالوجی سے۔برطانیہ چونکہ ہندوستان پہ دوسو سال سے زیادہ حکمران رہا ہے لہٰذا ہندوستان میں بھی برطانیہ نے علی گڑھ کی صورت میں ایک کالج کی بنیاد رکھی۔جسے سر سید احمد خان نے چلایا۔اسی علی گڑھ کالج سے مولانا محمد علی جوہر،مولانا ظفر علی خان،مولانا شوکت علی خان،شوکت اللہ انصاری،ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنہوں نے جمہوری اقدار کے لئے کام کیا۔اور سیاسی جدوجہد کو سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ اور کانگریس میں شمولیت کے ذریعے پروان چڑھایا۔اور اسی طرح ریلوے کا نظام لیں،یا کارخانوں یا ملوں میں لگنے والی مشینیں،فوجی ساز وسامان وہتھیار وغیرہ یہ سب ٹیکنالوجی کی صورتیں تھیں۔ان دو پہلوؤں پہ برطانوی دور میں ہندوستان متعارف ہوا۔مولانا عبیداللہ سندھی جو کہ انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد کا حصہ رہے تھے،اور اس کی پاداش میں چوبیس سال جلاوطنی میں گذارے،مختلف قسم کی صعوبتیں اٹھائیں، اس جلاوطنی کا مقصد برطانیہ سے اپنے ملک کی آزادی اور خودمختاری کے سوا کچھ نہ تھا۔لیکن جب بات عصری تقاضوں کی ہو اور اپنی قوم کی ترقی کی بات ہو تو وہ انتہائی وسعت نظری اور

حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانیہ کے ان اقدامات کی تعریف کرتے ہیں، کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ جمہوریت کے بغیر اب قومیں ترقی کی سیڑھی نہیں چڑھ سکتیں، اگر مسلمانوں کو یا ہندوستانی قوم کو آگے بڑھنا ہے تو سوائے جمہوریت کہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے برطانیہ کی طرف سے کانگریس کے قیام کی تعریف کی کہ اس عمل سے ہندوستانیوں کو جمہوریت کی تربیت کا موقع میسر آیا اور جمہوری طریقوں سے اپنے حقوق کی جدوجہد کا طریقہ سیکھنے کو ملا۔ نیز دور برطانیہ میں مقامی حکومتوں کے نظام کا تعارف بھی اسی سلسلے کی پیش رفت تھا جس سے معاشرے کے اندر ایک تنظیم پیدا کرنا مقصود تھا۔ آپ برطانیہ کا یہ احسان قرار دیتے ہیں کہ اس نے ہندوستانیوں کو جمہوریت سے متعارف کروایا۔ فرماتے ہیں:

> ''ایک صدی سے ہمارے ملک پر برطانیہ حکومت کر رہا ہے اس نے اپنا قبضہ جمانے کے لئے جو کام کئے اس وقت تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع تعلق کر لیجئے۔ لیکن جب اس نے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو اس نے ہمیں جمہوریت سکھلانا شروع کر دیا۔ اس کی بنائی ہوئی یونیورسٹیوں نے ہمارے نوجوانوں کو جمہوریت پسند بنا دیا۔ ہمارے ملک میں اسمبلی اور کونسل اسی جمہوریت پسند عناصر کو راضی کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب ہندوستانی راجہ اور نواب کی حکومت بھی اپنے ملک کی مشیر پارلیمنٹ کے سوا نہیں چل سکتی۔ یہ سب اسی جمہوریت پسندی کی برکت ہے۔''(36)

برطانیہ کے غاصبانہ قبضے کے خلاف ان کی جدوجہد آزادی کے ساتھ جڑا ہوا دوسرا اہم ترین مقصد ہندوستان میں ایک حقیقی اور مضبوط جمہوری نظام کے قیام کا خواب تھا۔ لہٰذا

انہوں نے اس کو عملی روپ دینے کے لئے سیاسی جمہوری پارٹی کا پروگرام ''مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی'' کے نام سے جاری کیا۔اس پروگرام میں اپنے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الف۔ہندوستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا،ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا۔''(37)

مولانا عبیداللہ سندھی انسانی ارتقاء کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے وہ جمہوریت کو عصری تقاضے کی حیثیت سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

''انسانی عمل خلا میں واقعہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے لئے تاریخی تسلسل ضروری ہوتا ہے اس تاریخی تسلسل کو توڑنے کے لئے ماحول کا بدلنا ناگزیر ہوتا ہے۔آج ہم سیکولر جمہوریت اور سوشلسٹ جمہوریت سے ہی اسے توڑ سکتے ہیں۔''(38)

یہاں آپ نے ''سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریت'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے ان کی مراد ایک ایسی جمہوریت جہاں پہ سیاسی اور معاشی مساوات موجود ہو، سیاسی مساوات سے مراد ہر فرد معاشرہ کو اپنی رائے کی آزادی میسر ہو اور وہ آزادانہ اپنی رائے کا ستعمال کرتے ہوئے حکومت کی تشکیل میں کردار ادا کر سکتا ہو۔اور اس طرح سوشلسٹ جمہوریت سے مراد ایسی جمہوریت جہاں چند سرمایہ دار جمہوریت کے نام پہ اداروں پہ قابض ہو کر لوگوں کی مجبوریوں کو اپنے سرمائے سے خرید کر یرغمال نہ بنائیں،معاشی طبقات نہ ہوں، ہر فرد کو یکساں معاشی حقوق حاصل ہوں اور وہ ترقی کرے اور خود کفالت حاصل کرے۔آج اگر ہم اپنے معاشرے کا تجزیہ کریں تو جمہوری نظام کی بقاء،اس کے تحفظ کے نعرے لگانے والی پارٹیاں اور شخصیات ایک انتہائی درجے کی منافقانہ روش کے ساتھ جمہوریت کے نام پہ ایک گھناؤنا

کھیل، کھیل رہی ہیں۔ جمہوریت کا پودا مقامی سطح پہ اگتا ہے اور وہ پروان چڑھنے کے بعد قومی سطح پہ اپنا پھل دیتا ہے۔لیکن ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ نچلی سطح پہ جمہوریت کو کبھی بھی پنپنے نہیں دیا گیا۔گذشتہ نصف صدی سے ملک کی تقدیر ان افراد اور گروہوں کے ہاتھوں میں رہی جنہوں نے جمہوریت کے نام پہ یا آمریت کے سائے میں عوام کو اپنی ذاتی یا خاندانی شناخت، مذہبی یا گروہی تقدس کی تعلیم و پروپیگنڈا کے ذریعے سیاسی کام کی عادت ڈالی، اور اسی بنیاد پہ نام نہاد جمہوری پارٹیوں کی تشکیل کی، اب صورتحال یہ ہے کہ جمہوریت کے نام پہ خاندانی پارٹیاں ہیں جن کی قیادت نسل در نسل چل رہی ہے۔ یہ غیر جمہوری خاندانی پارٹیاں اور شخصیات، جمہوریت کی چیمپئین بنی ہوئی ہیں، اور مزید افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان خاندانی پارٹیوں کے کرتا دھرتا اس ملک کے وڈیرے، جاگیردار، اور وہ مخصوص سرمایہ دار خاندان ہیں جو مستقل ملکی معیشت اور وسائل کو لوٹ رہے ہیں۔ان سرمایہ دار و جاگیردار خاندانوں نے ایسا میکنزم بنا دیا ہے کہ پورے ملک کے صوبائی اور قومی اسمبلی کے الیکشن میں وہی لوگ اپنے اپنے حلقوں سے منتخب ہوتے ہیں جنہیں سرمائے کی طاقت اور اثر رسوخ حاصل ہوتا ہے۔لہذا قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے اراکین کی فہرست اٹھا کر دیکھی جائے تو سب وہی لوگ ہیں جن کا عوام سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا ہے، وہ اپنے علاقوں کے بااثر افراد ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کے مسائل کو کیش کرتے ہیں اور انہیں طرح طرح خواب دکھاتے ہیں یا اپنی دھونس اور دھاندلی سے کثیر سرمایہ خرچ کر کے الیکشن میں سرخرو ہوتے ہیں، اور پھر جمہوریت زندہ باد کا نعرہ لگا کر پانچ سالوں کے لئے ملک اور قوم کے استحصال اور بربادی کا لائسنس لے لیتے ہیں، اب جو ان کی لوٹ کھسوٹ پہ تنقید کرے تو انہیں جمہوریت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔تو اس طرح سے ملک کے سیاسی نظام میں غیر جمہوری گروہوں نے اس قدر مضبوطی اختیار کر لی ہے کہ عام لوگ ان کی اس نوسر بازی کو سمجھ نہیں پاتے۔

آپ کے پاس سرمایہ ہونا چاہئے، جب چاہیں جہاں سے چاہیں الیکشن اپنے نام کر سکتے ہیں، بڑے آرام سے علاقے کے باثر فرد کو خرید لیں اور اسے اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے دیں، آپ کی پارٹی اقتدار میں آجائے گی۔اس طرح الیکشن دراصل ان کرپٹ اور موقع پرست افراد کے لئے سیزن ہوتا ہے جو اپنے علاقے کے لوگوں کو ہر الیکشن میں بے وقوف بنا کر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔لوگ اپنی سیاسی بے شعوری اور مفاد پرستی کی وجہ سے، قوم پرستی، لسانیت، فرقہ پرستی، گروہیت کی بنیاد پہ ووٹ ڈالنے جاتے ہیں، ان کی بلا سے ملکی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے تو پہنچے، ان کی بلا سے ملکی نظام تباہی سے دوچار ہوتا ہے، ان کی بلا سے ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے۔اس کے مظاہر آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں، یہی سیاستدان اور لیڈر اربوں، کھربوں کی چوری میں ملوث ہیں، لیکن ان کے ووٹرز کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں، کھلے عام ملکی معیشت کی تباہی، مہنگائی، توانائی کے بحران، تعلیمی بحران، صحت کی سہولیات کا فقدان، امن وامان کی تشویش ناک صورتحال کے باوجود لوگوں میں کوئی تحریک نہیں، وہی کرپٹ اور جھوٹے ہر دفعہ جلسہ بلاتے ہیں اور لوگ جوق در جوق اس میں شریک ہوتے ہیں، خوب نعرے لگاتے ہیں، واہ واہ کرتے ہیں ان کے ہر جملے پہ تالیاں بجاتے ہیں۔اور اپنی تمام پریشانیوں اور مسائل کو جوں کا توں لے کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔کسی میں اتنی جرات اور شعور نہیں کہ اس جھوٹے لیڈر کو سٹیج پہ کھڑا کر کے اسے اس کے جھوٹوں کی تاریخ یاد دلائے، اس کی کرپشن کا اس سے حساب لے۔یہ وہ ''سرمایہ دارانہ جمہورت'' کا نقشہ جو ہمارے ہاں نصف صدی اور دنیا کے دیگر ممالک میں عوام کو بے شعور رکھ کر ان کا

استحصال کرنے میں مصروف ہے۔مولانا عبید اللہ سندھی ایسی ''سرمایہ دارانہ جمہوریت'' کے حق میں نہیں تھے وہ اس لئے ''سوشلسٹ جمہوریت'' کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر وفلاسفی کو اپنے افکار کی اساس قرار دیتے ہیں، لہذا وہ نوجوانوں کو ولی اللہی تحریک کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس تحریک نے جس فکر کا پرچار کیا اس میں رد جمہوریت نہیں ہے، بلکہ شاہ ولی اللہ اوران کے جانشینوں نے جمہوری رویوں کو کسی بھی اجتماع کی ترقی کے لئے ضروری قرار دیا۔اس حوالے سے ان کا بیان ہے:

''ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو مساوات اور جمہوریت کا نمونہ مانتے ہیں اس لئے ہم مسلم اور غیر مسلم سے اس کا تعارف کراتے ہیں''۔(39)

لیکن یہاں مولانا عبید اللہ سندھی نے ولی للہی تحریک کو جمہوریت اور مساوات کا نمونہ قرار دیا ہے، لیکن انہوں نے جب اس تحریک کا تجزیہ کیا تو اس کی ناکامی کی وجہ بھی جمہوری رویوں کو ترک کرنا قرار دیا ہے آپ اس حوالے سے سید احمد شہید کی تحریک مثال دیتے ہوئے اس کی ناکامی کو بھی غیر جمہوری یا آمرانہ رویوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جب سید احمد شہید سکھوں کے خلاف لڑرہے تھے انہوں نے پشاور میں اپنی حکومت بنائی۔لیکن ہوا یہ کہ وہاں کے مقامی عوامی نمائندوں کو اہمیت نہ دینے اور اپنی شخصی اہمیت کو بڑھانے کی وجہ سے پوری تحریک ناکام ہوگی اور جن علاقوں پہ قبضہ تھا وہ ہاتھوں سے نکل گئے اور بالاخر شہادت پہ یہ سلسلہ ختم ہوا۔اس تحریک کے بارے میں ان کے تجزیئے پر مبنی اقتباسات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں

ا۔''تحریک ولی اللہی کی سیدھی سادی عوام مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا آج کی سیاسی زبان

میں سب سے بڑا تاریخی انحراف یا ترمیم پسندانہ اقدام وہ تھا، جو سید احمد شہید کی زندگی میں ہوا چنانچہ بجائے اس کے یہ تحریک قومی اور عوامی شاہراہ پر آگے بڑھتی یہ مذہبی فرقہ پرستی کی ایک رجعت پسندانہ تحریک بن گئی۔"(40)

۲۔"حضرت سید احمد شہید کتنے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو وہ بھی اسی رو میں بہہ گئے بجائے اس کے کہ وہ افغاں نمائندں پر مشتمل ایک جمہوری نمائندہ حکومت بناتے وہ خود امام مہدی بن گئے اور اس طرح سارا معاملہ عزر بود ہو گیا،تقریباً اسی زمانے مہدی سوڈانی ہوئے (1843۔۔1885ء) ان کی بغاوت سوڈانی عوام کی بغاوت تھی لیکن وہ بھی اسے جمہوری رنگ نہ دے سکے وہ مہدی بن گئے اب ان کے نام پر ایک گدی ہے جس کے نام لیوا رجعت پسندی کے سب سے بڑے نقیب ہیں، ہمارا مذہبی ذہن جمہوریت کا سوچ ہی نہیں سکتا۔"(41)

خلاصہ کلام

عبید اللہ سندھی دور جدید کے جن تقاضوں کی نشاندہی بیسویں صدی کے نصف میں کرتے ہیں آج بھی وہی سوالات ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ جائز و ناجائز کے جھگڑے، حلال و حرام کی لڑائی، ماضی کی خوش فہمیاں، دیو مالائی انقلابات کے چرچے، معاشی بدحالی اور بدترین معاشی غلامی، جمہوریت کے نام پہ غیر جمہوری استبدادی استحصالی نظام، یورپین نظام اور ان کے علوم و فلسفوں کا مطالعہ کے بعد خود کفالت کی منزل کی طرف بڑھنے کی بجائے، اپنے آپ کو جہالت اور بے شعوری کے نظام کے ملبے تلے دفن کیا جا رہا ہے، مشرق میں ہمارے گرد و پیش کے ممالک نے اسی یورپ کے علوم اور ٹیکنالوجی کو اپنے تعلیمی نظاموں اور اداروں میں رائج کیا اور اپنے قومی تقاضوں کی روشنی میں خود کفالت کی ان منازل کو چھو

رہے ہیں، جہاں یورپین ممالک کھڑے تھے۔لیکن ہمارا ملک جس کی اکثریت نوجوان نسل پہ مشتمل ہے، وقت کے ان تقاضوں سے دوری کی سزا جہالت اور سیاسی و معاشی پسماندگی کی صورت میں بھگت رہی ہے۔ نیا دور نئی دنیا بنانے کی بجائے دوسروں کی بنائی ہوئی دنیاؤں میں ہمارا نوجوان احساس کمتری کے ساتھ اپنے ماضی و حال کا ماتم کر رہا ہے۔ہم نے جمہوریت کو لعنت سمجھا، سائنسی علوم کو دنیاداری سمجھا، یورپین فکر کو ہم نے لادینیت کہہ کر پس پشت ڈال دیا، دنیا سے ہم فکری اور نظریاتی حوالوں سے کٹ کر علمی و فکری موت کا شکار ہو گئے۔نصف صدی میں سائنسی علوم کے نام پہ غیر معیاری یونیورسٹیاں بنائیں اور نوجوانوں کو غیر سائنسی فکر میں ڈبویا، صنعتی نظام کے نام کنزیومر کلچر کو فروغ دیا، مینوفیکچرنگ کلچر کو تعلیمی نظام سے نہ جوڑا، سیاسی نظام میں بدترین آمریت اور استبدادی جمہوریت کے ذریعے اکثریتی آبادی کو سولی پہ لٹکا رکھا ہے،مزدور، کسان و دیگر محنت کش طبقاتی نظام کے تحت ذلت کی زندگی گذارنے پہ مجبور ہیں۔کوئی ایسا پلیٹ فارم موجود نہیں جہاں نوجوان کی آزادانہ طور پہ عصری تقاضوں کے مطابق فکری و سیاسی تربیت کا انتظام موجود ہو، کیونکہ اس معاشرے میں جب بھی کوئی تبدیلی رونما ہوگی اس کا ہراول دستہ نوجوان ہوں گے۔لہذا عصری تقاضوں سے دور کرنے کے لئے بہت ساری دوکانیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں، کہیں نوجوان کو دیو مالائی انقلابات کے خواب دکھا کر اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں گم کر رکھا ہے، کہیں مذہب کے نام پہ انتہا پسندی اور گروہیت کے ذریعے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے، کہیں نوجوانوں کو سماجی زندگی سے کاٹ کر ان کی قوت عمل اور عقلی قوتوں کو برباد کیا جارہا ہے۔اب اس ساری صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم فکری انتشار سے لے کر جہالت، محرومی، معاشی غلامی، سیاسی عدم استحکام جیسے امراض میں مبتلا ہو کر زوال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اس وقت مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ آواز پورے معاشرے میں عام کرنے

کی ضرورت ہے کہ یورپ کی ترقیات سے استفادہ کرنا، ان کے علوم سیکھنا، ان کی ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنا، جمہوریت کو معاشرتی مزاج اور رویئے اور سیاسی نظام کے طور پہ اپنانا غیر اسلامی عمل نہیں ہے، یہ اس دور کا اہم ترین تقاضہ ہے، اس وقت مسلم معاشروں کی حالت زار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے زوال، عدم استحکام کے در پردہ یہ ہی اسباب نظر آتے ہیں۔ عبید اللہ سندھی نے ایک مذہبی عالم کے طور پہ اسلام، قرآن، سیرت رسول ﷺ، تاریخ اسلام، تاریخ ہندوستان، تاریخ انسانیت، دور جدید کے سیاسی انقلابات کے مطالعے اور تجزیئے کے بعد اپنا فکر پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا ''میں مذہبی آدمی ہوں میرے نزدیک مذہب ایک نا قابل انکار حقیقت ہے میں سمجھتا ہون کہ خدا کا انکار زندگی کے کمال کی نہیں بلکہ نقص کی علامت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے لئے سائنس کا انکار بھی ممکن نہیں، اگر ہم مشینی دور کی مخالفت کی اور صنعتی انقلاب کے دورس نتائج کو اپنی قومی زندگی میں نہ سمویا تو ہم مادی ترقی سے بالکل محروم ہو جائیں گے اور دنیا میں ہماری حیثیت اچھوتوں کی سی ہو گی۔''(42)

اگر آج ہمارا نوجوان ان کے اس فکر کو سمجھ لیتا ہے اور اسے اپنا تا ہے تو کوئی شک نہیں کہ ہم اپنی قوم اور ملک کو دیگر ترقی یافتہ اقوام کی صفوں میں کھڑا کر سکیں۔ اور اس سے بحیثیت مسلمان ہماری شناخت پہ کوئی حرف نہیں آئے گا۔

☆☆☆

باب سوم

جمہوری نظام کے قیام کے لئے نوجوان نسل کی تربیت

موجودہ معاشرے کی حالت زار

جیسا کہ گذشتہ ابواب میں واضح کیا گیا کہ عبیداللہ سندھی نے اپنے معاشرے کی سیاسی و سماجی پسماندگی کے علاج کے لئے دو پہلوؤں کو اہم ترین قرار دیا، نمبر ایک ''یورپین سائنسی علوم'' سے بھرپور استفادہ اور دوم'' جمہوریت'' اب ان دونوں تقاضوں کو عملی شکل میں ڈھالنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کو تربیت کے عمل سے گذرا جائے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ کسی بھی معاشرے کا اہم ترین عنصر نوجوان ہوتا ہے جس کے ہاتھوں قوم کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے، اگر نوجوان نسل کے لئے مناسب اور مربوط تعلیمی نظام موجود ہو تو یہ یقینی بات ہے کہ اس کے اثرات قوم کے حال و مستقبل پہ پڑتے ہیں۔ معاشرتی انقلاب کی کوئی بھی تحریک بغیر نوجوانوں کی تربیت، تنظیم اور جدوجہد کے کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا احسن نظام ہی کسی قوم کے اچھے مستقبل کی نوید سنا سکتا ہے، اگر آج ہم اپنے معاشرے کا مشاہدہ کریں نوجوان نسل میں سچائی، ایمانداری، عزت نفس خوداعتمادی کا فقدان نظر آتا ہے۔ قومی و اجتماعی سوچ کی بجائے انفرادیت پسندی، مفاد پرستی، شخصیت پرستی،

رجعت پسندی اور انتہا پسندی کے روگ میں نوجوان مبتلا نظر آتے ہیں، عصری عقل وفکر سے محرومی نوجوانوں کو درست سمت میں چلنے میں دشواری پیدا کر رہی ہے، سیاسی بے شعوری کی وجہ سے ہر ایک سیاسی بازی گر انہیں اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے آج اگر معاشرے کی فرسودگی کے پیچھے اگر کوئی حقیقی محرک ہے تو وہ نوجوان طبقے کی بے شعوری، عدم تربیت اور ان کا مفاد پرستوں کے ہاتھوں استحصال ہے۔ صحیح درست سمت میں تربیت نہ ہونے کی وجہ سے آج نوجوانوں کو انقلاب کے نام پہ، نام نہاد لبرل ازم کے نام پہ، کوئی ذاتی اصلاح کے نام پہ، اور کوئی مذہب اور عقیدہ کے نام پہ، کوئی سیاست اور قومیت کے نام پہ استعمال کرتا ہے، کبھی تو انہیں مذہب کے نام پہ فرقہ پرستی اور عدم برداشت سکھائی جاتی ہے تو کبھی انہیں لسانیت کے نام، کبھی قومیت کے نام پہ متشدد رویوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اگر نوجوان اپنی روحانی اصلاح کے لئے کسی مکتبہ فکر کے ساتھ جڑتا ہے تو اسے اتنا تنگ نظر بنا دیا جاتا ہے کہ وہ دیگر افراد معاشرہ سے ذہنی اور نظریاتی طور پہ کٹ کے رہ جاتا ہے، ایک اور ظلم اس نوجوان نسل پہ یہ کیا جا رہا ہے کہ اسے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم وتربیت کے نظام سے محروم رکھا جا رہا ہے جس کی وجہ سے نوجوان دیگر اقوام کے مقابلے میں نہ صرف ذہنی، علمی عقلی صلاحیتوں میں پیچھے رہ گئے بلکہ ان کا ملکی معیشت میں تخلیقانہ کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کا نتیجہ احساس کمتری، بیروزگاری اور مایوسی کی صورت میں نکل رہا ہے۔ ہم دن بدن ایک ناکارہ اور فرسودہ تعلیمی، سیاسی ومعاشی نظام کی بدولت نئی نسل کو کھوتے جا رہے ہیں۔ ملک کی تجارت، صنعت، تعلیم، صحت، ماحولیات روبہ تنزل ہیں اور استحصالی طبقات فرسودہ تعلیمی وسیاسی نظام کے ذریعے اپنے گروہی مفادات کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔

اب اس زوال سے نکلنے کا واحد راستہ نئی نسلوں کی بہتر تربیت کے ذریعے ملک میں حقیقی جمہوری نظام کا قیام ہے اور اس کے لئے نوجوانوں کی شعوری تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے

اندر قائدانہ صلاحیتیں پیدا کرنا بھی ضروری ہے تا کہ وہ اپنی قوم وملک کی بہتر انداز سے قیادت کے قابل ہوسکیں۔اقوام کی تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ سچی اور دیانت دار قیادت ہی نے اقوام کے اندر اجتماعیت پیدا کر کے انہیں ترقی کی منازل سے ہمکنار کیا ہے، دنیا کی حالیہ تاریخ نے قیادت کی بہت ساری مثالیں ہمارے سامنے پیش کیں، اگر ہم اپنے پڑوسی ملک چین کا جائزہ لیں تو نصف صدی پہلے وہاں ہمارے ملک سے بھی بدتر حالات سے معاشرہ دوچار تھا لیکن ماؤزے تنگ اوران کی ٹیم نے ایسی قومی قیادت فراہم کی کہ وہ ملک چین جوزوال سے ہمکنار تھا، دیکھتے دیکھتے دنیا کی سپر پاورز کی صف میں شامل ہوگیا،اسی طرح کم ال سنگ نے شمالی کوریا کوایسی قیادت فراہم کی جس نے ایک کمزورقوم کواپنے پاؤں پہ کھڑا کردیا،اسی طرح ایرانی قیادت کی مثال ہمارے سامنے ہے، روس، جاپان،کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا کی معاشی ترقی کی وجہ ان کے ہاں مخلص اورایماندار قیادت ہے،خودامریکہ اور یورپ کی اقوام کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جہاں قومی سطح پہ ابھرنے والی قیادتوں نے اپنی اقوام کو جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے نقصانات سے نکالا، پھر سے انہیں ترقی وکمال کی راہوں پہ ڈالا، وہ شہر جنہیں ایٹم بم کی تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، آج وہی شہر دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں شمار ہوتے ہیں۔یہ سارے کمالات وترقی دراصل ایک بہترین قومی قیادت اور بہترین قومی نظاموں کی بدولت وقوع پذیر ہوئے۔اگر ان اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ان کے سیاسی نظام اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہیں کہ ان کے حکمران طبقات پیشہ ور سیاستدان نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنی اقوام کے مستقبل کواپنی شبانہ روز محنت سے محفوظ کیا۔

دراصل سیاسی نظام میں قیادت چونکہ عوام سے ہی آتی ہے لہذا ان کے مدنظر عوام ہی کی فلاح و بہبود ہوتی ہے، وہ اس طرح کا سیاسی اور معاشی نظام بناتے اوراسے مضبوط کرتے ہیں جس سے عوام کا مستقبل محفوظ ہوجائے اور ہر آنے والا دن پہلے دن سے بہتر ہو۔یقیناً سیاسی نظام

میں شریک یہ لوگ سیاست دان کہلاتے ہیں، لیکن ان کا مطمع نظر اپنا ذاتی مال بنانا یا جاہ پرستی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک ایسا نظام اور ڈھانچہ وضع کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں، جس سے قوم میں خود کفالت پیدا ہوتی ہے دوسری اقوام کے مقابلے میں قومی عزت بڑھتی ہے۔

لیکن اگر دنیا بھر میں زوال پذیر معاشروں کا جائزہ لیں تو ان کے زوال اور پستی کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ وہاں قیادت کا فقدان ہے، ان پسماندہ ممالک میں ہم بھی شامل ہیں۔اس فقدان کی وجہ دراصل یہ ہے کہ سیاست ایک پیشہ سمجھ لیا گیا ہے، ایک سیاستدان حکومت واقتدار میں شامل ہونے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے، معاشرے میں اپنا اثر رسوخ قائم کرنے اور اپنے جائز و ناجائز کاروبار کو تحفظ دینے کے لئے سیاست کرتا ہے، اس کے لئے وہ لوگوں کو ایک آلے کے طور پہ استعمال کرتا ہے۔''جمہوریت''''عوام'' کے نام سے اس سیاست کے کاروبار کو اگر دیکھنا ہو تو پاکستان سمیت ان غریب اور پسماندہ ممالک کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم اگر اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتحال انتہائی شرمناک اور افسوسناک نظر آتی ہے، گذشتہ نصف صدی سے ہمارا ملک قیادت کے بحران کا شکار ہے، سیاستدان اور فوجی آمر ملکی اقتدار پہ قابض ہوتے ہیں اور اپنا اپنا حصہ پورا کر کے اس قوم کو بے یار و مددگار معاشی و سیاسی مسائل سے دوچار کر کے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔اگر پاکستان میں سیاسی قیادت کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو سیاستدان تو موجود رہے ہیں لیکن ایک مضبوط اور ایماندار قیادت کی ہمیشہ کمی رہی ہے، سیاستدانوں اور بیوروکریٹوں کی یہ روش رہی کہ وہ حکومت میں آتے رہے، اپنی ذاتی و خاندانی جاگیروں، کاروباروں، تجارتوں کو تو ترقی دیتے رہے لیکن انہوں نے قومی معیشت کو زوال پذیر کیا، سیاستدان لوگوں سے جھوٹ، دھن، دھونس اور دھاندلی سے حمایت لیتے رہے اور مسند اقتدار کے مزے لوٹتے رہے اور

جب اقتدار ختم ہونے کا وقت آیا تو اگلے الیکشن کے لئے سوچتے اور منصوبے بناتے رہے۔انہوں نے قطعاً یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ 1947 کے بعد ملکی معیشت اور قومی ادارے کس طرح مضبوط کئے جائیں اور انہیں ترقی اور خود کفالت کی راہ پہ کیسے ڈالا جائے؟ عوام کے لئے وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم، صحت، انفراسٹرکچر، ودیگر سہولیات کو بہتر سے بہتر کیسے بنایا جائے؟ انہوں نے اتنی زحمت گوارا نہیں کی کہ بدلتے ہوئے عالمی حالات کے تناظر میں ملک کے قومی تعلیمی اداروں کو جدید سہولیات سے آراستہ کر کے ملک کی تقدیر کیسے بدلی جائے؟ تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے گورنس کا شفاف نظام کیسے بنایا جائے؟ ہر ادارے کو انہوں نے نصف صدی پرانے اور فرسودہ نظام کے تحت چلایا تاکہ قومی خزانے کو زیادہ سے زیادہ لوٹا جائے، اور اپنے استحصالی اقتدار کو طول دیا جائے۔اس فرسودہ نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند صرف اس وجہ سے پاکستان سے بھاگ رہا ہے کہ اس کے لئے یہاں اپنی صلاحیتوں کو درست انداز سے بروئے کار لاکر اپنے کیریئر بنانے کا کوئی میکنزم نہیں ہے۔یہاں میکزم صرف یہ ہے کہ آپ کا تعلق کسی سیاستدان، کسی سیاسی پارٹی یا بیوروکریسی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح استوار ہونا چاہئے تو آپ کی تجارت بھی چلے گی، کاروبار بھی ترقی کرے گا اور آپ کو اچھی نوکری بھی ملے گی، لیکن ایسا نہیں ہے تو پھر اس ملک سے بھاگنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں بچتا۔ہمارے ملک کے باصلاحیت نوجوان اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ ترین سائنس اور ٹیکنالوجی کے اداروں میں اپنا لوہا منوا رہے ہیں، اگر ان نوجوانوں کو اپنے ملک میں بہترین مواقع میسر آتے تو وہ کبھی بھی باہر نہ جاتے۔

یقیناً اس وقت قیادت کے اس بحران سے نکلنے کی سخت ضرورت ہے، قوم کو اگر اپنا مستقبل محفوظ کرنا ہے تو پھر حقیقی ایماندار، اور قومی سوچ رکھنے والی مخلص قیادت کا انتخاب کرنا پڑے گا

ورنہ اس وقت جو صورتحال ملک کو درپیش ہے اس میں سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پہ نوجوان نسل کو اس صورتحال کا سنجیدگی سے ادراک کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ اگر آج نوجوان نسل اس صورت حال پہ آنکھیں بند کر دیتی ہے اور صرف اپنی ذاتی مفاد کے لئے جدوجہد میں مصروف رہتی ہے اور اجتماعی حوالے سے، ملکی اور قومی ترقی وخوشحالی کے لئے نہیں سوچتی تو آئندہ نسلیں بھی اسی ماحول میں جینے پہ مجبور ہوں گی اور ہمیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کریں گی۔ اس ساری صورتحال سے نکلنے کا راستہ مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر میں موجود ہے، وہ نوجوان نسل کو عصری تقاضوں کے مطابق علمی وسیاسی تربیت کے ذریعے قائدانہ کردار کے لئے تیار کرنے کا فکر دیتے ہیں۔

نوجوان نسل پہ اعتماد

چونکہ مولانا عبیداللہ سندھی نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اس نہج پہ چاہتے تھے کہ وہ سیاسی حوالے سے قومی قیادت کے قابل ہو جائیں لہذا وہ تربیت یافتہ نوجوانوں کو قومی قیادت سونپنے پہ زور دیتے تھے اور ان کی صلاحیتوں پہ اعتماد کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ تحریک آزادی کے دوران جب آپ نے طویل سفر کئے، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مختلف ممالک میں طرح طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑا، کبھی معاشی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا، اور کبھی تو سیاسی حالات نے انہیں مشکل میں ڈالا، تو کہیں دیگر اقوام کے نظریات کو سمجھنے کے لئے ان کی زبانوں کو ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑی، کہیں سفری صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، ان تمام حالات وآزمائش میں آپ کے ساتھ نوجوانوں کی ایک ٹیم ہمیشہ موجود رہی جس نے آپ کا ہر سطح پہ ہر طرح کے حالات میں قدم بہ قدم ساتھ دیا۔ جب وہ کئی سالوں کی محنت وجانفشانی کے بعد وطن واپس لوٹے تو انہوں نے اپنی ذات کو کبھی کریڈٹ نہیں دیا،

بلکہ ان ساری کاوشوں کو ایک ٹیم کی کاوش قرار دیتے ہیں وہ اپنے کام کو نوجوانوں کا کام قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں اسلامی تعلیمات کی تحصیل وتکمیل میں عمر کا بڑا حصہ صرف کر چکا ہوں۔ ہندوستان کے اندر اور اسلامی ممالک میں اسلامی ترقی کی کئی اسکیمیں بننے اور ان کے ناکام ہونے کا تجربہ رکھتا ہوں۔ یورپ وایشیاء کے کئی ملکوں میں پرانی شاہی حکومتیں تباہ ہوتی دیکھ چکا ہوں اور انقلاب کے بعد نوجوانوں کی کمزور جماعتوں کو کامیابی سے طاقتور حکومتیں بنانے کا بھی کافی مشاہدہ رکھتا ہوں۔ میں جس کام کو اپنے نام سے کہتا ہوں حقیقت میں وہ نوجوانوں کی ایک جماعت کا کام ہے جن کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا ہوں۔''(43)

مولانا عبیداللہ سندھی کا نوجوانوں پہ اعتماد اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو فعال بنانا اور ان کے ساتھ مل کر ایک ٹیم کے طور پہ کام کرنا ایک قابل تقلید مثال ہے، اس تناظر میں آج نام نہاد رہنماؤں کے کردار کو بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح وہ اپنی ذات کو اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اپنے ذاتی وگروہی مفادات کی تکمیل کے لئے نوجوانوں کو استعمال کرتے ہیں اور کسی بھی کامیابی اور جدوجہد کا سہرا اپنی ذات تک محدود کر دیتے ہیں، مولانا عبیداللہ سندھی کی نوجوانوں سے محبت اور ان کا ازحد اعتماد فقط کسی ایک طبقے، مذہب یا مسلک کے نوجوانوں تک محدود نہ تھا آپ نے عربی مدارس کے نوجوان ہوں یا جدید تعلیم کے اداروں سے متعلقہ نوجوان ہوں، ان کا جو بھی مسلک ہو یا مذہب ان کو اپنی تحریک کا حصہ بنایا اور ان کے ساتھ یک جاں ہو کر سیاسی جدوجہد کی۔ اپنے ساتھی نوجوانوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرے سمع وبصر (آنکھ وکان) اور میرے ہاتھ پاؤں وہی ہندوستانی نوجوان ہیں اس میں عربی مدرسے کے طالب علم اور کالج کے تعلیم یافتہ مساوی درجہ پر شریک رہے نیز

تعلیم یافتہ طبقہ میں سے ہندو اور سکھ بھی ہمارے شریک کار تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ میں آج تک کوئی یورپین زبان نہیں جانتا محض میرے مطالعہ کے لئے میرے ان رفیقوں نے ہزاروں صفحہ کی کتابیں ترجمہ کیں"(44)

مولانا عبید اللہ سندھی یہ چاہتے تھے کہ ان نوجوانوں کو جو عصری علوم سے آشنا ہو چکے تھے اور انتہائی اخلاص سے سیاسی نظام کی تبدیلی کے لئے کام کرنا چاہتے تھے اور اقوام عالم میں علمی و صنعتی ترقی کے ذریعے باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے تھے ان کی قیادت پہ اعتماد کا اظہار کیا جائے، خاص طور پہ اس طبقے کو انہوں نے مخاطب کیا جو کہ عصری تقاضوں سے بے بہرہ تھا اور وہ پرانی غیر جمہوری روایات و نظریات کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھا اور اپنی فرسودہ فکر کو معاشرے پہ مسلط کرنے میں سرگرداں تھا، آپ نے انہیں ان عصری انقلابات سے خبردار کیا جنہوں نے معاشروں کی کایہ پلٹ دی، اور انہیں ان قابل نوجوانوں کی سیاسی قیادت میں تبدیلی کا مشورہ دیا، آپ کا کہنا تھا:

"اگر آپ اپنے نوجوان کو جو انقلابی یورپ سے آشنا ہو چکا ہے اپنا رہنما مان کر اس انقلاب سے عہدہ برآ ہونے کا خیال نہیں رکھتے تو آپ کا وہی حشر ہوگا جو بخارا کے مسلمان کا ہو چکا ہے۔"(45)

آپ نے نوجوانوں کی طاقت اور ان کی فکر جدید پہ مبنی انقلابی سیاست پہ اعتماد کرنے پہ زور دیتے ہوئے مزید فرمایا:

"آپ فقط اپنے نوجوان کا ساتھ دیجئے وہ اپنے ملک میں قومی حکومت پیدا کرے گا۔"(46)

یقیناً یہ ایک اعلیٰ درجے کا اعتماد اور بھروسہ تھا ان نوجوانوں کے لئے جو اپنی قوم کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے، اس تناظر میں آج بھی نوجوان نسل پہ بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے، ہمارے

ہاں یہ روش موجود ہے کہ جو نوجوان عصری علوم سے واقفیت رکھتا ہے اور دور جدید کے تقاضوں کے مطابق ملک میں تبدیلی کا خواہاں ہے اسے مختلف ہتھکنڈوں سے مایوس کیا جاتا ہے مختلف جماعتوں کے اندر ایسے نوجوانوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا، ان کی صلاحیتوں کو قومی مفاد میں استعمال میں لانے کی بجائے ایک مخصوص گروہ یا طبقے کے مفادات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے، کہیں اسے دہریہ قرار دیا جاتا ہے تو کہیں اسے مغرب زدہ قرار دیا جاتا، اور بعض اوقات اس کو دنیادار قرار دے کر اسے مایوسیوں میں دھکیلا جاتا ہے مولانا عبید اللہ سندھی کا پیغام یہ ہے کہ ان نوجوانوں کی قدر کی جائے ان کی صلاحیتوں کو ملک اور قوم کی ترقی کے لئے استعمال میں لانے کی حکمت عملی اپنانی چاہئے۔ایسے نوجوانوں میں مایوسی اور احساس کمتری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ نوجوان نسل آگے بڑھ کر ملک اور قوم کی بھاگ ڈور سنبھال سکے۔مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنی فکر اور پروگرام پہ جس قدر یقین اور ایمان تھا اسی قدر انہیں نوجوانوں پہ اعتماد تھا آپ نے نوجوانوں کے سامنے اپنا نظریہ اور پروگرام پیش کیا اور نوجوانوں کو دعوت دی کہ اس انقلابی فکر کو سمجھیں اور اپنے معاشرے میں تبدیلی لائیں آپ نوجوان طاقت پہ از حد اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ کام ہمارے ذہین نوجوانوں کا ہے اگر وہ ادھر متوجہ ہوئے تو ہمارے اس فکر کی بنیاد پر ہسٹاریکل لاج کھڑی کردیں گے۔''(47)

نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا اہتمام

مولانا عبید اللہ سندھی کو یہ یقین تھا کہ جس نئے دور کی نئی فکر کی وہ دعوت دے رہے ہیں وہ ان ذہین نوجوانوں کے لئے ہے جو اس کو سمجھنے کی استطاعت رکھتے ہیں، اگر وہ نوجوان اس فکر کو سمجھ لیں گے تو وہ ایک نئی تاریخ رقم کریں گے۔آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہر صورت اپنی

فکر کو نوجوانوں تک پہنچائیں گے،فرماتے ہیں''میں اگرچہ ضعیف ہوں، بوڑھا ہوں مگر میں بفضل تعالیٰ بہت جلد نوجوانوں کو سکھادوں گا۔''(48)

آپ کی توجہ نوجوان نسل کی طرف تھی آپ بڑھاپے میں جلد از جلد نئے دور کی فکر کو نوجوانوں تک پہنچانے کے لئے بے تاب تھے،آپ ان دماغوں کو جو اس وقت ہر طرف سے مایوسی کا شکار تھے خاص طور پہ اس وقت مسلم لیگ اور جمعیت العلماء ہند کے سیاسی افکار وعمل سے مایوس تھے اور دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اپنی سیاسی فکر کو پروان چڑھانا چاہتے تھے ان پہ توجہ دینا چاہتے تھے۔آپ کا کہنا تھا:''ہم ان روشن خیال و پریشان دماغ طاقتوں (لیگ اور جمیعت العلماء ہند سے مایوس) کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرنا چاہتے ہیں۔''(49)

آپ کا یہ طرز عمل انتہائی اہمیت کا حامل تھا، یہ سچ ہے کہ جب بھی کسی قوم کا نوجوان مایوسی کا شکار ہو جائے وہ قوم اس وقت تک سنبھل نہیں سکتی جب تک نوجوانوں سے مایوسی نہ ختم کی جائے،آج بھی نوجوانوں کے اندر سے مایوسی ختم کرنے کی ضرورت ہے،انہیں ایک ایسے نظریئے سے جوڑا جائے جو ان کے لئے امید کی کرن ثابت ہو اور وہ مستقبل کی بہتری کے لئے درست سمت میں جدوجہد پہ آمادہ ہو جائیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی چاہتے تھے کہ نوجوانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی شعوری تربیت کا بھی مکمل نظام موجود ہو کیونکہ ملک میں حقیقی تبدیلی لانے کے لئے نوجوان ہی بہتر اور نتیجہ خیز جدوجہد کر سکتے ہیں،لہذا انہوں نے نوجوانوں کی سیاسی تربیت کے لئے ہی سیاسی پارٹی کا آغاز کیا،ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں

''فارورڈ بلاک کے طور پہ مولانا جو گروپ کانگریس کے اندر منظّم کرنا چاہتے،جس کے ذریعے کانگریس کو اس کے اصول و مقاصد سے ہٹنے نہ دیتے اور رہنمائی کا کام لینا تھا،اس کا نام

مولانا نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی رکھا تھا اسے صرف کانگریس کے اندر ہی ایک فارورڈ بلاک کے طور پر کام نہ کرنا تھا، بلکہ یہ کانگریس کے باہر بھی اک منظّم جماعت تھی جس کے سامنے نوجوانوں کی سیاسی تعلیم وتربیت کا ایک مکمل نظام تھا۔" (50)

مولانا عبیداللہ سندھی نے جلاوطنی کے دور میں مختلف معاشروں میں برپا ہونے والے انقلابات کا تجزیہ کیا، وہ اس نتیجے پہ پہنچ چکے تھے کہ ان انقلابات کے پیچھے عصری تقاضوں کی تبدیلی اور پسماندہ اور غالب طبقات کی جنگ تھی، انہوں نے اس امر کا بھی تجزیہ کیا کہ جس معاشرے میں نوجوان منظّم ہو گئے اور انہوں نے سیاسی شعور حاصل کر لیا ہو تو انہوں نے اپنے ملکوں میں استحصالی طبقات کے تختے الٹ دیئے اور انہیں برے انجام سے دوچار کر دیا۔ اس عمل میں انہوں نے کسی کو معاف نہیں کیا، چاہے وہ استحصالی طبقات مذہبی یا غیر مذہبی ان کا تعلق جس قوم، قبیلے سے تھا انہیں انجام سے دوچار کر دیا۔ اسی تجربے کی روشنی میں ہندوستان میں بھی اقتدار اور وسائل پہ قابض طبقے کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ ظلم واستحصال سے باز آجائے اور پسماندہ طبقات کی حالت کو دیانت داری سے بہتر بنانے کے لئے اقدامات کرے وگرنہ وہ نوجوانوں کی قیادت میں منظّم ہو گئے تو انہیں برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ 7 مارچ، 1939ء کو مولانا سندھی وطن لوٹے تھے واپسی پہ انہوں نے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا

"اگر تمہارے امرا نے غربا کی خیر خواہی نہ کی تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو بخارا کے مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔" (51)

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے فکر کی روشنی میں سندھ میں اول درجے میں نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا کام شروع کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ اس وقت سندھ میں پسماندگی بہت زیادہ تھی دوسرا آپ کا تعارف زیادہ تھا، ماضی میں آپ نے مختلف اداروں میں علمی وسیاسی کام کیا تھا اور

یہاں کافی عرصہ تک قیام کیا تھا لہذا وہ سندھ کے عوام کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف تھے۔اور سمجھتے تھے کہ یہاں کے نوجوانوں میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ تبدیلی کے لئے کام کر سکتے ہیں۔لہذا ''جلا وطنی سے واپسی کے بعد انہوں نے سندھ کو اپنے سیاسی خیالات کی تجربہ گاہ بنانے کا فیصلہ کیا،وہ چاہتے تھے کہ سندھ میں ان کے اصولوں کے مطابق ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لئے مثالی ثابت ہو۔''(52)

لہذا آپ نے ایسے ادارے بنانے کا پروگرام مرتب کیا جس میں نوجوانوں کی سیاسی تربیت کی جائے۔وہ چاہتے تھے کہ نوجوانوں کو تشدد سے بچا کر انہیں عدم تشدد کی بنیاد پہ بہترین سیاسی شعور سے بہرہ مند کیا جائے تا کہ وہ آگے چل کر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سیاسی نظام تشکیل دینے کے قابل ہو سکیں۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری عدم تشدد کی پالیسی کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''مولانا سندھی کے نزدیک یہ اصول بذاتہ مقصود نہ تھا، بلکہ وہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ لازم تھا۔تعلیم وتربیت کا جب بھی کوئی نظام بنایا جائے گا۔اس کے بہترین نتائج کے حصول کے لئے امن و پرسکون ماحول کی ضرورت ہوگی۔عہد غلامی میں جب تحریک آزادی زوروں پر چل رہی تھی،ملک میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور حکومت کسی قسم کے تشدد کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی،ضروری تھا کہ عدم تشدد پر اپنے اعتقاد کے اعلان و اظہار کے ساتھ کوئی گوشہ عافیت تلاش کر یا جائے، جہاں اصحاب استعداد کی تربیت ہوتی رہے اور تحریک کو ذہنی،فکری اور افرادی قوت سے کمک پہنچائی جاتی رہے۔''(53)

مولانا عبید اللہ سندھی چاہتے تھے کہ نوجوان خصوصاً مسلمان نوجوان سیاسی تربیت حاصل کریں اور اپنی الگ سیاسی تنظیم بنانے کی بجائے ہندوستان میں موجود قومی سیاسی جماعت

میں شریک ہو کر بہتر کردار ادا کریں۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں۔

''مولانا سندھی ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے وہ اپنی الگ تنظیم قائم نہ کریں، بلکہ ملک کی کسی بڑی قومی اور ترقی پسند جماعت میں شریک ہو جائیں۔''(54)

آپ کالج کے نوجوانوں کو اپنی تحریک کا حصہ بنانے پہ زور دیتے ہیں، اپنے ایک خط میں مولانا دین محمد وفائی کو لکھتے ہیں

''ہمیں اپنی تحریک کو کالج اور اس کے ساتھ کالجیٹ اسکول کی شکل میں بڑھا کر رفقاء پیدا کرنے آسان ہوں گے۔''(55)

آج کے دور میں بھی آپ کی اس حکمت عملی پہ غور کیا جا سکتا ہے، بجائے اس کے کہ نئی سیاسی پارٹیاں بنائی جائیں قومی سطح پہ کام کرنے والی کسی پارٹی میں شامل ہو کر اس کے کردار کو مکمل طور پہ بدلا جا سکتا ہے، لیکن اگر قومی سطح پہ کوئی بھی پارٹی اس قابل نہیں تو پھر مستقل الگ جمہوری سیاسی پارٹی کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اور اس طرح ہر حال میں نوجوانوں کی مکمل سیاسی و نظریاتی تربیت کی ضرورت ہوگی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے نوجوانوں کی سیاسی و فکری تربیت کے لئے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی (جو کہ کانگریس کے اندر ایک فارورڈ بلاک کے طور پہ بنانے کی تجویز دی)، اور تعلیم و تربیت کے لئے ادارے جن کو آپ نے ''بیت الحکمت'' کا نام دیا قائم کئے۔ ''مولانا سندھی کا ارادہ تھا کہ بیت الحکمت کی شاخیں ملک کے ہر حصے میں قائم کی جائیں، لیکن جو شاخیں قائم ہوئیں وہ سندھ اور پنجاب میں قائم ہوئیں۔ دارالحکومت دہلی کے بعد سندھ اور پنجاب مولانا سندھی کی علمی و سیاسی سرگرمیوں کے سب سے بڑے میدان تھے۔۔۔۔ کراچی میں بیت الحکمت کی شاخ کراچی مدرسہ مظہر العلوم (محلّہ کھڈا) میں قائم تھی''(56)

گوٹھ پیر جھنڈا میں ''24 ،دسمبر 1939ء کو دارالرشاد میں بیت الحکمت کی شاخ قائم ہوئی۔''(57)

''گوروپہوڑ تحصیل شکار پور(ضلع سکھر)میں مولانا سندھی کے عقیدت مندوں نے بیت الحکمت کی شاخ قائم کی۔مولانا سندھی مرحوم نے اس کا افتتاح کیا تھا۔مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اس کے صدر مدرس تھے۔''(58)

اس کے علاوہ ''شہداد کوٹ میں بیت الحکمت کی ایک شاخ قائم ہوئی،اس کے سر پرست مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور سیکرٹری مولوی عزیز اللہ جروار تھے۔''(59)اور ''ضلع لاڑکانہ میں بیت الحکمت کی دوسری شاخ گوٹھ پیر بخش بھٹو میں قائم ہوئی اس کے سر پرست نواب نبی بخش بھٹو تھے اور سیکرٹری مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی تھے۔''(60)اوراسی طرح ''بیت الحکمت کی ایک شاخ بہاول پور کے ایک مقام دین پور میں قائم ہوئی تھی۔''(61)

مذکورہ بالا تمام اداروں کے مقاصد پہ بات کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے خطبہ افتتاح محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل سکول،مورخہ 2،اگست 1944ء،بمقام شہداد کوٹ،ضلع لاڑکانہ،سندھ میں فرمایا ''یہ اسکول اور کالج ہم اس لئے شروع کرتے ہیں کہ اپنے نوجوانوں میں سیاسی شعور پیدا کردیں۔''(62)

عبیداللہ سندھی نے ''مورخہ 22/24 مارچ 1939ء محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج لاہور کے قیام کا اعلان کیا''(63)

اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کو ہم یورپ کے اول درجہ کے کالجوں کا ہم رتبہ بنانا چاہتے ہیں۔''(64)

مولانا عبیداللہ سندھی محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کے اغراض ومقاصد میں بیان کرتے ہیں کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے سیاسی تربیت یافتہ افراد معاشرے کی خدمت

خلق کے لئے تنظیمیں بنانے اور طبقہ علماء سے مذہبی وسیاسی تعلیم وتربیت کا کام لیں۔ بیان فرماتے ہیں:

''(ج) طبقہ علماء ان سیاسین کی رہنمائی میں خدمت خلق کی جماعتیں بنائے گا۔ ملک کے ادنیٰ طبقہ کو مذہبی اور سیاسی تعلیم دے گا۔ ان کے اقتصادی حالات کو درست کرنے کے لئے کواپریٹو سسٹم جاری کرے گا۔

(د) ادنیٰ طبقہ کو ووٹ کی قیمت سمجھائے گا اور کسی پارٹی کو ان کے ووٹ سے ناجائز فائدہ حاصل نہیں کرنے دے گا۔''(65)

مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ سیاسی تربیت وعمل کی کوششیں قابل تحسین تھیں ان کا مرکز عمل نوجوان طبقہ تھا وہ اس سے کافی پر امید تھے لیکن بد قسمتی سے انہیں اتنا وقت میسر نہیں آیا کہ وہ ان اداروں کو مضبوط ومستحکم کر سکتے اور ان کے نتائج حاصل کر سکتے اور ملک میں کوئی بڑی سیاسی تبدیلی کے لئے کام کر سکتے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں

''بیت الحکمت کا منصوبہ مولانا کی تمنا ہی نہ تھی جو مولانا اپنے ساتھ لے گئے بلکہ مولانا نے جو آرزو کی تھی اسے عمل میں بھی لے آئے تھے اور ایک حد تک انہوں نے اس میں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ لیکن اسے جاری رکھنا مولانا مرحوم کے ہم فکر اہل علم اور ان کے معتقدین کا کام تھا۔ ان کی عدم توجہ اور بے عملی کے لئے مولانا سندھی مرحوم کی ذات کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔''(66)

افسوس کا مقام ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے وطن لوٹنے کے بعد جن اداروں کی بنیادیں اپنے فکر کی روشنی میں رکھیں اور ان کے اصول ومقاصد متعین کئے آج اتنے سالوں کے بعد ان کا نام ونشان نہیں ملتا، شاید ان ناموں سے کچھ مدارس موجود ہوں اور مولانا عبیداللہ سندھی کے نام پہ یادگاریں، مساجد کے نام وغیرہ بھی موجود ہوں، شاید مولانا عبیداللہ سندھی کے نام

پہ ان کی پیدائش اور وفات کے ایام منانے کا بھی بندوبست موجود ہو، لیکن اگر کوئی کام نہیں ہوا تو ان کی فکر ونظریہ پہ کسی حقیقی جمہوری سیاسی پارٹی کا قیام اور نہ ہی ایسے تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جو کہ یورپ کے تعلیمی داروں کا ہم پلہ ہو اس عظیم مفکر کی فکر تو دور کی بات ہے ان کے نام تک کو عام طور پہ لوگ نہیں جانتے، ان کے نظریات پہ مبنی لٹریچر کو مخصوص حلقہ جاتی اور گروہی مقاصد کے ساتھ انتہائی علمی وفکری بے ایمانی سے منتھی کیا گیا اور اس کی روح کو ختم کر دیا گیا ہے۔

ان کے وہ سارے خواب ادھورے رہ گئے جن کا اظہار انہوں نے اپنے سیاسی پروگراموں میں کیا، وہ جس ''بیت الحکمت''اور''تھیالوجیکل کالج'' کی بات کرتے تھے وہ ''یورپین تعلیمی اداروں کے ہم پلہ'' ہونے کی بات کرتے تھے، جہاں نوجوانوں کو عصری علوم سے اس طرح مستفید کیا جائے کہ وہ ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے اہل ہو جائیں۔ایک جمہوری سیاسی پارٹی کی بات کرتے تھے، وہ سب کہاں گیا؟ ان کے نام لیواؤں پہ ایک قرض ہے اور خاص طور پہ ان عناصر کے ضمیروں پہ بوجھ ہونا چاہئے جن کا دال دلیا مولانا عبیداللہ سندھی کے نام پہ چل رہا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نوجوانوں کی تربیت کے لئے ''یورپ کے درجہ کے کالج'' کی بات کرتے ہیں، یعنی اگر آج کے دور میں اس کا جائزہ لیں تو ایسا ادارہ جہاں جدید نظام تعلیم کے تمام لوازمات موجود ہوں، وہاں ایسے تمام علوم کی تدریس وتحقیق کا نظام ہو جن کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہو، چونکہ اب تمام شعبہ ہائے زندگی کے علوم سائنس کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، لہذا اسی نہج پہ مضامین کے درس وتدریس کا باقاعدہ نظام موجود ہو۔ٹیکنالوجی کے میدانوں میں سرخرو ہونے کے لئے صنعتی علوم اور نت نئی ایجادات کرنے کی صلاحیتیں حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرنا بھی ایسے اداروں کے دائرہ اختیار میں شامل ہوتا ہے نیز سماجی

علوم، نفسیات کا علم، طبی علوم ہوں، تاریخ، فلسفہ یا سیاست کا علم، سب ہی دور جدید کے نصاب کے مطابق ہی پڑھائے جانے والے ادارے کو ہم ''یورپ کا ہمہ پلہ'' ادارہ کہہ سکتے ہیں، اور پھر اس طرح کے ادارے کا تمام سلیبس، تعلیمی نظام اس معیار پہ پورا اترتا ہو جو آج کے دور میں پوری دنیا میں قابل عمل وتسلیم ہے۔ یورپ کا ہم پلہ ہونے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ ان سے بہتر استعداد حاصل نہیں کرسکتا، یقیناً بعض مشرقی اقوام نے یہ کر دکھایا، انہوں نے یورپ کے علوم کا مطالعہ کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر بہتری لائے کہ آج یورپ سے بہتر معیار کے تعلیمی وتحقیقی ادارے پیدا کئے بلکہ یورپ کے مقابلے میں بہتر سے بہتر ٹیکنالوجی میدان میں لے آئے۔ اور اپنی قوم کو یورپ کا ہمہ پلہ یا اس سے بہتر بنا لیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ایسے ہی ترقی پیدا کرنے والے ادارے کا تخیل رکھتے تھے، مگر افسوس کہ ان کے معتقدین اوران کے نام پہ اپنے حلقوں کو کامیاب بنانے والے ان کی فکر کو جدید تعلیمی اداروں کی صورت میں ڈھالنے میں مکمل ناکام ہو چکے ہیں۔ اب فقط ان کے نام پہ اپنے حلقوں کا تقدس بنانے میں جٹے ہوئے ہیں۔

لیکن اس ناکامی کو ان کے نظریات کی ناکامی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ان کے نظریات آج بھی مسلمان نوجوانوں کو امید کی نئی کرن دکھاتے ہیں، کیونکہ کم وبیش آج بھی ہمارے معاشروں کی صورتحال ویسی ہی ہے جیسی ان کے زمانے میں تھی۔ لہٰذا آپ کی فکر کا مطالعہ کر کے نوجوانوں میں سے فکری جمود کو توڑا جا سکتا ہے، اس جمود کی وجہ سے ہمارا نوجوان تذبذب کا شکار ہے، آج کی جدید دنیا سے ہم آہنگ ہونے سے کتراتا ہے، مولانا عبیداللہ سندھی کا فکر نوجوانوں کو اس تذبذب کی کیفیت سے نکالنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، آپ مسلمان نوجوانوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر اپنی قوم کو ترقی سے ہمکنار کرنا ہے۔ تو یورپ سے بے اعتنائی نہ بھرتیں، اور اس بات سے خائف مت ہوں کہ ان کے مذہب کو کوئی گزند

پہنچی گی، آپ کا کہنا تھا ”مادی ترقی کے لئے ہمیں یورپ کے لبرل ازم اور مکینکل ازم دونوں کو بخوشی قبول کرنا چاہئے۔“(67)

لہذا آپ نے عملی طور پہ اپنی سیاسی پروگرام میں یورپ کے لبرل ازم اور مکینکل ازم کو اساسی اصول میں شامل کرلیا آپ بیان کرتے ہیں کہ ”ہمارے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ سندھ ساگر پارٹی پروگرام میں ہم ان دونوں امور کو اساسی اصول میں داخل کر دیا۔“(68)

آپ کے اس بیان کی اگر وضاحت کی جائے تو یورپ کے ”لبرل ازم“ سے مراد ”جمہوریت“ ہے، جمہوریت دراصل صرف سیاسی نظام تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسے رویئے کا نام ہے جہاں انسانی معاشرے میں بسنے والے تمام انسان ایک دوسرے کی رائے کا احترام کریں، اور بلاتفریق مذہب، جنس، حیثیت، فرقہ، نسل وغیرہ انہیں اپنی رائے کے اظہار کی مکمل آزادی ہو، سماجی زندگی میں روادارانہ طرز عمل اختیار کریں، انتہا پسندی کی بجائے اعتدال پسندی سے باہمی معاملات کو حل کریں، بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے کسی قسم کا امتیاز مدنظر نہ رکھا جائے۔ اجتماعی حقوق کو مقدم سمجھا جائے، قانون کی بالادستی اور احترام ہو، ایسے قوانین نہ بنائے جائیں جن سے انسانی حقوق متاثر ہوتے ہوں۔ آمریت یا آمرانہ سوچ کسی بھی شعبے، ادارے میں قابل قبول نہ ہو۔ مولانا عبیداللہ سندھی نہایت واضح انداز میں یورپ کے اس جمہوری فکر یا رویئے کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اس کو ریاستی وحکومتی اداروں کی تشکیل کا ذریعہ بنانے پہ زور دیتے ہیں۔

اور مکینکل ازم سے مراد یورپ اور آج کی تمام ترقی یافتہ اقوام کے وہ تمام تر سائنسی علوم جن کا تعلق زندگی کے تمام شعبہ جات سے ہے، جس میں سول اور فوجی ٹیکنالوجی دونوں شمار ہوتے ہیں۔ اس میں صنعتوں کا نظام، جدید دور کی ٹیکنالوجی سے لیس زراعت کا نظام اور تخلیق و

تحقیق کے وہ سارے نظام اور طریقے جنہیں اختیار کر کے یورپ اور امریکہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلابات برپا کئے۔ دور جدید کے ان دونوں تقاضوں کو مولانا عبیداللہ سندھی اپنے خطابات میں بارہا بیان کر چکے ہیں، انہیں آج کے دور میں زیادہ بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اپنے نظریہ اور فکر کو حتمی اور آخری نہیں سمجھتے، وہ ان ذہین دماغوں کو جوان کا فکر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں ایک راستہ دکھاتے ہیں جسے اختیار کر کے وہ آگے بڑھ سکتے ہیں ہوسکتا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے بدلنے سے نئے مسائل اور نئی جہتیں سامنے آئیں لہذا وہ اگر درست راستے کا انتخاب کریں گے تو پیش آمدہ نئے مسائل سے بھی عہدہ برآ ہوسکیں گے، لہذا وہ ہر دور کے نوجوانوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کے فکر کو جدید اسلوب میں پیش کریں

آپ فرماتے ہیں کہ" میرا فکر میری تمام تر کوشش اپنے نوجوانوں کو یہ بات سمجھانے کی رہی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس طرح میں یہ بات کہتا ہوں اسی طرح ہی یہ ہمیشہ کہی جائے میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور آئے میرے اس فکر کے سلسلے کو اور آگے لے جائے اور اسے آج کی زبان واسلوب میں پیش کرے۔"(69)

یہ ارتقاء کا تقاضہ ہے کہ کوئی بھی نظریہ یا رائے ہر دور میں حتمی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے، وقت کے تقاضے بدلنے سے بہت کچھ بدل جاتا ہے، لہذا اسی حقیقت کو اس اقتباس میں مولانا بیان کرتے ہیں، وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی اس فکر کو جدید دور کے تقاضوں کے تناظر میں مزید پرکھا اور بیان کیا جاسکتا ہے۔

انفرادیت پسندی اور شخصیت پرستی کے نقصانات

مولانا عبید اللہ سندھی جس سیاسی پروگرام کا پرچار کرتے تھے اور عصر حاضر کے مطابق جس جمہوری سیاسی نظام کی تشکیل کی دعوت دیتے تھے اس کا عمل میں آنا بغیر اجتماعیت کی فکر کے ممکن نہ تھا، اس کا اندازہ انہیں اپنے سیاسی تجربات سے بخوبی ہو چکا تھا، کیونکہ سیاسی تبدیلی کے لئے پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور پارٹی بغیر اجتماعی سوچ کے تشکیل نہیں پا سکتی۔، علماء صوبہ بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں 3 جون 1939ء میں خطاب کرتے ہوئے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں:

''میں ایسے زمانہ میں ہند سے باہر رہا ہوں جسے دور انقلاب کہنا چاہئے، بڑی بڑی سلطنتیں فنا کے گھاٹ اتاری جارہی تھیں، ان کی جگہ ہر قوم کے بہادروں کا جو دستہ عمر بھر مصیبتوں میں مبتلا رہا ہے اب پارٹی پالیٹیکس کے اصول پر اپنی مختصر جماعت کے زور پر نئی حکومتیں بنا رہا ہے، ایسے زمانے میں چوٹی کے سیاسیین سے استفادہ کا موقع ملتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اس عالمگیر انقلاب کی حقیقت اور اس کے اساسی اسرار سمجھنے کے قابل ہو گئے۔'' (70)

تاریخ گواہ ہے کہ انسانی معاشروں میں آنے والی تبدیلیاں جماعتوں یا اجتماعی جدوجہد کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ فردکی ترقی اجتماع کے بغیر ممکن نہیں مل جل کر تعاون باہمی کے اصول پر ریاستی اداروں کی بہتری، معاشرتی زندگی کے نظام کی تشکیل ہی فرد اور قوم کی ترقی کا باعث بنتی ہے، لہذا معاشرے کے اندر ہر فرد کو اجتماعیت کی تعلیم دینی ضروری ہے جس سے افراد کے اندر مل جل کر اپنے مسائل کو حل کرنے کا شعور پیدا ہو، اور اس سے قومی و ملکی ترقی کا سلسلہ جاری و ساری رہ سکے، اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں

''فرد کی ترقی کا راستہ اجتماع سے ہو کر گذرتا ہے اس لئے تعلیم ایسی ہونی چاہئے جس سے اجتماعیت Society پیدا ہو اور اسے ترقی حاصل ہو۔'' (71)

یعنی اجتماع یا جماعت میں ہی انسانی معاشرہ ترقی کی منازل طے کرسکتا ہے، کوئی بھی شخص تن تنہا کسی بھی طرح کی کامیابی یا ترقی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہذا مولانا عبیداللہ سندھی کا کہنا یہ ہے کہ معاشرے کو ایسی تعلیم سے بہرہ مند کیا جانا چاہئے جس سے اجتماعیت پیدا ہو، انفرادیت اور تفرقہ پیدا نہ ہو، تعاون باہمی پہ ایسی سوسائٹی کا قیام عمل میں آئے تا کہ انسانی معاشرہ ترقی کی راہ پہ گامزن ہو۔ اور اسی طرح جب کوئی معاشرہ اجتماعی طور پہ زوال پذیر ہو جائے تو اسے زوال سے نکالنے کے لئے بھی اجتماعی جدوجہد درکار ہوتی ہے، اور یہ جدوجہد جماعتوں کی صورت میں ممکن ہوتی ہے جو افراد کو جمع کر کے انہیں منظّم کر کے ان کی تربیت کر کے سیاسی و معاشی نظاموں میں تبدیلی لے آتے ہیں۔ خاص طور پر سیاسی سطح پر آنے والی تبدیلیاں اجتماعی جدوجہد ہی کا نتیجہ رہیں۔ انسانی تاریخ کے جتنے انقلابات آئے اس میں افراد معاشرہ کی منظّم جدوجہد نے اہم کردار ادا کیا، خصوصاً عصر حاضر کے انقلابات کا مطالعہ کریں تو بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بغیر اجتماع کے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ لہذا یہ فطری اصول ٹھہرا کہ جب کبھی معاشرتی زندگی میں اجتماعی زوال پیدا ہوگا تو اس کو دور کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد ہی کارآمد ہو سکتی ہے مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں۔

''انسان اجتماع society میں رہ کر ہی ترقی کرسکتا ہے خود اس کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے اجتماع مل کر ایک انسانی برادری بن جائے۔'' (72)

اجتماعی جدوجہد یا جماعت سازی کے نظریئے کو سب سے زیادہ نقصان انفرادی نقطہ نظر کے مطابق لکھی جانے والی تاریخ نے پہنچایا ہے جس سے انسانی معاشروں میں اجتماعیت کی

بجائے انفرادیت کے نظریئے کو فروغ حاصل ہوا اور اس سے انسانی معاشرے کی وحدت کو نقصان پہنچا۔ عام طور پر تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مئورخین نے تاریخ لکھتے وقت مقتدر شخصیات ہی کو زیادہ تر موضوع سخن بنایا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہونے والی تبدیلیوں کو چند بڑی شخصیات کے ہی مرہون منت قرار دیا گیا۔ اور ان کے دور میں ان کے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے جو بحثیں اور حالات بیان کئے جاتے ہیں وہ ان ہی کے گرد گھومتے ہیں اور تمام تبدیلیوں اور انقلابات کو ان ہی سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی تاریخ دانی کے اس انفرادی نقطہ نظر کو آمریت کی پیداوار قرار دیتے ہیں، آپ فرماتے ہیں "بدقسمتی سے ایک طویل زمانے سے ہمارے اہل علم تاریخ کو انفرادی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ مرض ہمارے ہاں ظالم بادشاہوں کے دور کی یادگار ہے۔ جبر (ظلم) کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ جماعت کی بجائے فرد پر زور دیا جاتا ہے۔"(73)

اگر اس وقت اپنی تاریخ کا جائزہ لیں تو کچھ یہی صورت نظر آتی ہے۔ کہ اہل اقتدار یا مخصوص شخصیات کی ذاتی زندگی اور ان کے کارناموں کو یا تو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تو یا مخالف شخصیات کی خامیوں سے تاریخ کو سجایا جاتا ہے۔ قوموں کا تجزیہ ان کے اجتماعی نظاموں کے بارے میں تفصیلات اور اجتماعی تبدیلی، زوال وعروج پہ بحث کی بجائے صرف ایک مرکزی شخصیت کے گرد سارے معاملات گھومتے نظر آتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی اس بارے میں بیان کرتے ہیں "تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور واقعات کے تغیر وتبدل کو اجتماعی قوموں کی بجائے چند اشخاص پر محمول کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے ہماری تاریخ کی کتابیں قوموں کی مجموعی زندگی اور ان کے ارتقاء وزوال پر بحث کرنے کی بجائے بادشاہوں اور ممتاز افراد کے حالات کی کھتونیاں (بہی کھاتے) بن گئی ہیں۔"(74

مولانا عبیداللہ سندھی چاہتے تھے کہ نوجوان نسل کوانفرادی کی بجائے اجتماعی نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کروایا جائے اور جب تاریخ لکھی جائے تو انفرادی کی بجائے اجتماعی نقطہ نظر سے لکھی جائے یعنی اُس زمانے کی اجتماعی تحریک اور وہ اجتماعی حالات، جواس وقت اُس قوم کو درپیش تھے ان کا تجزیہ کیا جائے اور اُس دور کے اجتماعی نظام کی خرابیوں اور خوبیوں پہ بحث کی جائے۔تاریخ دانوں نے ایک منفیت یہ بھی پیدا کردی کہ شخصیتوں کے ساتھ اجتماعی نظاموں کواس طرح جوڑ دیا گیا کہ اُسی شخصیت کی بدولت وہ نظام قائم ہے وہ رخصت ہوئی تواس کے ساتھ ہی نظام رخصت ہوگیا،اس تاریخ دانی کی ذہنیت کومولانا عبیداللہ سندھی رد کرتے ہیں۔کہتے ہیں''تاریخ میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم کی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی اوراس نے ایک مختصر سی مدت میں قوم کوکہیں سے کہیں پہنچادیا لیکن جونہی وہ شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی اس کے ساتھ اس کی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہوگئی۔''(75)

تاریخ کا جب مطالعہ کیا جائے تو یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ ہر دور کے بادشاہوں یا برسر اقتدار شخصیات کی ذاتی خامیوں اور خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔اوراس طرح سے اس کے اجتماعی کاموں اوراچھے اقدامات جو کہ اس نے پورے معاشرے کی ترقی کے لئے انجام دیئے ہوتے ہیں ان پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔اس شخصیت کواتنا بدنام کیا جاتا ہے کہ اس کے اردگرد پنپنے والے تمام اچھے حالات کی نفی ہوجاتی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں''بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کواچھالنے کی طرف سے ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی۔''(76)

اس کی مثالیں دیتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ''اکبر(بادشاہ) کے معترضین کا بھی کچھ ایسا حال ہی ہے وہ اکبر کواس کے حالات اور ماحول سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انہیں اس

مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اس کی شخصیت کیساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔"(77)

اور بیسویں صدی میں ترکی کے انقلاب، سیاسی حالات اور وہاں عصر حاضر کے مطابق رونما ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے مثال دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ

"خود ہمارے زمانے میں مصطفیٰ کمال کی ایک مثال موجود ہے مرحوم کی بے دینی اور الحاد کے متعلق کئی شواہد پیش کئے جاتے ہیں اور ایک نہیں سینکڑوں کتابیں اس قسم کے واقعات سے پر ہیں لیکن دیکھنے والوں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے، مصطفیٰ کمال کو ترکی میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ترکی کے حالات کچھ ایسے تھے کہ ترکی قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا۔"(78)

جب کسی معاشرے میں اجتماعیت کی بجائے انفرادیت کے نظریات فروغ پا جاتے ہیں تو افرادِ معاشرہ میں بزدلی اور احساس کمتری پیدا ہوتی ہے مولانا عبیداللہ سندھی کا کہنا ہے "خدا ان کو اپنی ذاتی قوتوں سے غافل کر دیتا ہے وہ اجتماعی قوت سے کام کر سکتے تھے لیکن اس کے متعلق خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے کیونکہ اب وہ انفرادی الخیال (Individual minded) بن چکے ہیں۔ اجتماعیت کا خیال ان کے دلوں سے نکل چکا ہے اس لئے وہ کسی اجتماعی کام کے کرنے کا اپنے اندر یقین ہی نہیں پاتے۔ انہوں نے اجتماعیت کو چھوڑا تو انفرادی الخیال ہو گئے اس کے بعد رفتہ رفتہ ان میں احساس کمتری (inferiority complex) پیدا ہو گیا جو انفرادیت پسندی (individualism) کا لازمی نتیجہ ہے اب ان کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں گذرتا کہ ہم بھی کوئی کام اجتماعی قوت سے کر سکتے ہیں۔"(79)

تاریخ دانی کے انفرادی نقطہ نظر کی وجہ سے تاریخ کے اوراق مخصوص شخصیات کی خوبیوں

،صفات اور کمالات کے مجموعوں سے بھرے نظر آتے ہیں اس طرز عمل کا یہ نتیجہ آمرانہ روش کے طور پہ ظاہر ہوا، تاریخ کا مطالعہ کرنے والے افراد کے اندر شخصیت پرستی اور انفرادیت کا نظریہ پیدا ہوا، اجتماعی سوچ کا فقدان ہوگیا۔ فرواحد کے حوالے سے ہیروازم کا ذہن پیدا ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ اجتماعی جدوجہد کرنے کی بجائے کسی ہیرو اور اعلیٰ طلسماتی شخصیت کے انتظار میں برائی اور فرسودگی کو برداشت کرنے کا ذہن بن گیا۔ تاریخ کے اس انفرادی نظریہ سے معاشروں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ،لٹریچر سے لیکر فنون لطیفہ تک اور سماجی علوم سے لیکر مذہبی وسیاسی عقائد ونظریات تک ہر سطح پر انفرادیت کا یہ دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ انسانوں کے ذہنوں نے انفرادیت کے اس خول کے اندر محدود ہو کر معاشرے میں اپنی جدوجہد کو شعار بنالیا لہذا معاشرتی دوڑ میں فقط اپنی ذات مدنظر ہوگئی۔ اجتماعی شعور کی جگہ انفرادی اغراض ومقاصد نے لے لی۔ اب ہر فرد فقط اپنی ذات کے بارے میں فقط اپنے کیریئر کے بارے میں سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس انفرادیت پرستی کے عفریت نے معاشروں کو خودغرض بنادیا۔ افراد معاشرہ ایک دوسرے سے دست وگریبان ہو گئے۔ طاقتور کمزور کو کچلنے لگا اور کمزور طاقت حاصل کر کے طاقتور کو شکست دینے کا سوچنے لگا لے دے کہ اگر کوئی سمجھدار فرد رہتا ہے تو وہ ہیروازم کے طلسم میں گرفتار ایک انجانے ہیرو کے انتظار میں زندگی کی مشقتیں کاٹ رہا ہوتا ہے۔

اگر عصر حاضر میں ہم جائزہ لیں تو عام زندگی کے اندر یہ مظاہرے عام ہیں فلم ،ڈرامہ، کہانیاں ،افسانے ،واقعات میں ہیروازم کی تبلیغ نظر آتی ہے ایک شخص ہے سارے جہاں کی خوبیاں اور کمال اس کے اندر ہے اور وہ تن تنہا بڑی سے بڑی تبدیلی لے آتا ہے۔ بڑی سے بڑی جنگ لڑکر فتح یاب ہوتا ہے۔ اب اس طرح ہیرو کو ایسے دلفریب انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ ذہن اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سپر مین، ٹارزن، اوراسی طرح کے دیگر کردار

اس کی مثالیں ہیں۔سیاسی میدان میں تو اس ذہنیت نے اس قدر نقصان سے دو چار کیا کہ اجتماعی تبدیلی کا عمل رک چکا ہے۔ایک سیاسی لیڈر کو تمام خوبیوں اور جمہوری اقدار کا منبع قرار دیا جاتا،شخصیت ہے تو پارٹی ہے شخصیت نہیں تو نہ ہی جمہوریت ہے اور نہ ہی پارٹی ہے،اس طرح کی بیمار ذہنیت کی وجہ سے آمرانہ روش معاشرے میں جڑ پکڑ چکی ہے،اگر کوئی فوجی طالع آزما سیاسی نظام پہ قابض ہو جاتا ہے تو لوگ اس کی خوبیوں کے گُن گا گا کر اسے ''قومی ہیرو'' بنا لیتے ہیں اور اس طرح جمہوری رویے جو کہ اجتماعی جدو جہد کا نتیجہ ہوتے ہیں معاشرے میں دم توڑ جاتے ہیں،شخصیت ہی مقدم ٹھہرتی ہے نظریات یا اجتماعیت کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اس طرح لوگ سیاسی تنظیم کی بجائے شخصیت کی پوجا کرتے ہیں شخصیت گئی تو پارٹی ختم،اور اس طرح اگر زوال سے نکلنے کے لئے تنظیمی جدو جہد کی بجائے کسی ہیرو یا عظیم لیڈر کے انتظار میں نسلیں بیٹھی رہتی ہیں۔مذہبی حلقوں میں اسی کی ایک شکل تقدس اور مخصوص آمرانہ طرز عمل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

معاشرے میں خصوصاً نوجوان نسل اس کا شکار ہے۔اجتماعی سوچ اور اجتماعی تبدیلی کی سوچ کا فقدان ہے مل جل کر ایک طاقت بنا کر تبدیلی لانے کی فکر کا دور دور تک نشان نہیں۔ہیرو ازم کی یہ تصوراتی دنیا عملی زندگی سے قطعاً مختلف ہے۔نوجوان جب ہیرو ازم کے نشے میں مست جب عملی زندگی کے معاملات میں شامل ہوتے ہیں تو اس قدر کمالات کا مجموعہ نہ بننے کی وجہ سے مایوسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں انفرادیت کی سوچ ان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ نوجوان نسل شخصیت پرستی کے بھنور میں اس قدر پھنس جاتی ہے کہ غور وفکر اور شعوری تجزیہ کی سوچ فقط ایک شخصیت کے تقدس کے سامنے ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔آنکھیں بند کئے بھیڑ بکریوں کی طرح شخصیتوں کے پیچھے چلنے کی روش عام ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفاد پرست عناصر عوامی طاقت کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں کیونکہ

عام آدمی بے شعوری کی حالت میں فقط تقلیدی ذہن کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

تاریخ کا یہ انفرادی نقطہ نظر اجتماعی قومی تبدیلی کی سوچ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ جب نظاموں کی تبدیلیاں فقط چند شخصیات کے مرہون منت ٹھہریں تو اب نہ تو وہ شخصیات پیدا ہوں گی اور نہ وہ تبدیلی ہوگی۔اب عملی طور پر کوئی شخصیت چاہے کتنی بھی بڑی صاحب کمال ہو وہ تن تنہا کوئی کمال پیدا نہیں کر سکتی۔لازمی امر ہے کہ اسے دوسرے افراد معاشرہ کی ضرورت پڑے گی۔تاریخ کے مطالعے میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا گیا کہ چند شخصیات ہی تبدیلیاں لائیں ہیں حالانکہ اگر اجتماعی نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جتنی بھی شخصیات تاریخ میں گذری ہیں انہوں نے بغیر دیگر افراد یا جماعتوں کے کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ان کے ارد گرد رونما ہونے والی تبدیلیاں ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والی جماعتوں کی بدولت تکمیل پذیر ہوئیں لہذا آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔بغیر اجتماع یا جماعت کے بڑی سے بڑی شخصیت بھی کوئی اجتماعی تبدیلی کی اہل نہیں ہو سکتی۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے تاریخ کے اسی مغالطے کو سمجھنے کی دعوت دی ہے انہوں نے تاریخ کو انفرادی کی بجائے اجتماعی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کی تعلیم دی ہے وہ بتاتے ہیں کہ جب کسی دور کی اجتماعی تبدیلی کا مطالعہ کرنا شروع کریں تو اس دور میں کام کرنے والی جماعتوں اور اداروں کی تفصیلات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کریں اور ان جماعتوں کے اجتماعی کردار سے آگاہی حاصل کریں نیز اس دور کے تمام اجتماعی حالات وتقاضے بھی زیر مطالعہ رکھیں اس سے مختلف واقعات کو اجتماعی حوالے سے دیکھنے کی عادت بنے گی۔اور ہر دور کے تقاضوں کا اجتماعی شعور پیدا ہوگا اس طرح اجتماعی نقطہ نظر سے تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے سے اجتماعی جدو جہد کا نظریہ اور سپرٹ پیدا ہوتی ہے۔اجتماعی نقطہ نظر سے سوچنے اور کام کرنے سے دوسرے افراد معاشرہ کی فلاح و بہبود کی فکر پیدا ہوتی ہے نیز معاشرہ پر آنے والی اجتماعی خرابی اور

مصیبت کے مقابلے میں مل جل کر جدو جہد کا نظریہ وعمل پیدا ہوتا ہے اجتماعی جدو جہد کا یہ عنصر آگے چل کر معاشرے کی ہمہ گیر اخوت ، ہمدردی اور رواداری کا باعث بنتا ہے اس اجتماعی جدو جہد کا نظریہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت پرستی اور ہیروازم کی نفسیاتی وبا سے جان چھوٹتی ہے شخصیات کے طلسم میں مبتلا ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے ،ایک اجتماعی جدو جہد کے ذریعے خود معاشرے کی تقدیر کو بدلنے کو شعور پیدا ہوتا ہے اسی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں ''سیاست اجتماع سے پیدا ہوتی ہے۔'' (80) یعنی اگر سیاسی نظام کی تبدیلی یا اس کی تشکیل کی جدو جہد کرنی ہے تو اس کے لئے اجتماع کی یعنی ''جماعت'' کی ضرورت پڑے گی۔لہذا تن تنہا بڑے سے بڑا عظیم انسان کوئی اجتماعی تبدیلی نہیں لاسکتا جب تک اس کے ساتھ مضبوط جماعت نہ ہو۔

آپ فرماتے ہیں

''انسانی تاریخ پر نظر ڈالو اور دیکھو کیا ایک مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ ایک شخص ایمان اور عمل صالح کے باوجود اپنے ساتھ اپنے جیسے ہم خیال لوگوں کو جمع کئے بغیر اکیلا اور تن تنہا اجتماع میں اپنے ایمان کو غالب کرنے میں کامیاب ہو گیا؟ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔'' (81)

مولانا عبیداللہ سندھی جہاں جمہوری قدروں اجتماعیت اور اداروں کی بالادستی کا پرچار کرتے ہیں وہاں وہ انفرادیت پسندی اور شخصیت پرستی کے بھی سخت خلاف ہیں۔اگر چہ ان کی اپنی شخصیت ہندوستان کی تحریک آزادی کے حوالے سے قربانیوں اور ان تھک جدو جہد کی عمدہ مثال ہے۔اور علمی حیثیت سے لیکر سیاسی بصیرت اور مذہبی تشخص کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہ تھے۔اپنے پیرو کاروں اور چاہنے والوں کے اصرار کے باوجود کبھی انہوں نے اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا، بلکہ انہوں نے ہمیشہ جماعت کی طرف بلایا

ہے۔جماعتیں بنانے کی تلقین کی ہے۔جماعت بندی کے فوائد بیان کئے اور شخصیت پرستی اور انفرادیت کے روگ سے نکلنے کا راستہ بتایا ہے۔اجتماعی نقطہ نظر اپنانے کی دعوت دی ہے۔اگر ان کی تفسیر سے لیکر سیاسی مقالات تک کا تجزیہ کیا جائے جہاں بھی نظر جاتی ہے۔انہوں نے شخصیت پرستی اور انفرادیت کی بجائے اجتماعیت اور اجتماعی جدو جہد کی فکر پیش کی ہے۔شخصیت پرستی سے اجتناب کے حوالے سے آپ کے شاگرد پروفیسر سرور ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''یہ 1942ء کا ذکر ہے۔مولانا سندھی لاہور آئے ہوئے تھے اور مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے ہاں قیام فرما تھے۔ظہیر الدین صاحب جنہوں نے انہی دنوں مولانا سندھی کی ایک کتاب شائع کی تھی اور راقم الحروف نے صلاح کی کہ مولانا کی ایک بڑے سائز کی تصویر تیار کرائی جائے جس کے نیچے علامہ اقبال کے ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں ''مردحر'' کے عنوان سے جو اشعار ہیں،ان میں سے چند شعر دیئے جائیں،اور تصویر کی اشاعت کی جائے،ہم دونوں اجازت لینے خدمت میں حاضر ہوئے،مولانا کی طبیعت ناساز تھی،بخار تھا اور ساتھ ہی بڑے زور کی کھانسی آرہی تھی۔اس کے باوجود سلسلہ گفتگو شروع ہو گیا۔اسی کے دوران میں ظہیر صاحب نے بڑی عقیدت وانکسار سے اس خیال کا اظہار کیا اور آپ سے اجازت چاہی۔یہ سننا تھا کہ مولانا بگڑ گئے اور بڑے جوش میں کہنے لگے کہ میں اپنی تصویر ان اشعار کے ساتھ شائع کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔مسلمانوں کے دماغ میں یہ خیال راسخ ہو گیا۔کہ قوم کو پستی سے نکالنے کے لئے کوئی غیر معمولی شخصیت چاہئے اور ضروری ہے کہ یہ شخصیت اعلیٰ طبقے سے آئے۔امام مہدی کا تصور دراصل اسی غلط ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔بدقسمتی سے ڈاکٹر اقبال بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے۔یہ تصور بڑا مضرت رساں ہے اس سے قوم میں اپاہج پن پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی آنے والے کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھی

رہتی ہے۔میں اس ذہنیت کو ختم کرنا چاہتا ہوں میری کوشش یہ ہے کہ قوم یہ سمجھے کہ غریب ،بے کس،غیر معروف اور غیر خاندانی طبقوں سے بھی مصلح اور قائد پیدا ہو سکتے ہیں ضروری نہیں کہ یہ سادات میں سے ہوں،یا ان کا خاندان صدیوں سے ممتاز چلا آتا ہو۔اشراف پسندی کی اس ذہنیت نے مسلمانوں کو مفلوج کر رکھا ہے میں اس کا سخت مخالف ہوں۔"(82)

مولانا عبید اللہ سندھی اپنی ذات کے حوالے سے مبالغہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔
پروفیسر سرور لکھتے ہیں

"طویل جلاوطنی کے بعد جب آپ واپس وطن آ رہے تھے تو اخبارات میں آپ کے بارے میں مضامین چھپے،روز نامہ"زمیندار" لاہور کے ایک مضمون میں یہاں تک لکھا گیا کہ مولانا ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے ان کی ابتدائی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔اور یہ جب آپ ماسکو گئے تو لینن کی بیوی آپ کے وضو کے لئے پانی گرم کرتی وغیرہ وغیرہ۔مولانا نے مکہ ہی سے روز نامہ انقلاب کو ایک مضمون بھیجا جس میں لکھا کہ میری شخصیت ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدوں شرم محسوس کئے پڑھ نہیں سکتا۔اس مضمون میں اپنے حالات زندگی کے ذیل میں لکھا میں میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیاں والی) میں پیدا ہوا،ہمارے خاندان کا اصل پیشہ زرگری ہے لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ کرتے رہے۔"(83)

مولانا عبید اللہ سندھی شخصیت کی بجائے جماعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"شخصیت کا کمال ہوتا ہے لوگ بعد میں اس کمال کو چھوڑ دیتے ہیں اور شخصیت کو سب کچھ بنا لیتے ہیں اس سے اس شخص کے خاندان اور پھر اس کی قوم کا خصوصی امتیاز پیدا ہو جاتا ہے،جیسا کہ یہودیوں اور مسلمانوں میں ہوا کہ وہ بحیثیت یہودی اور مسلمان اپنے آپ کو باقی

سب قوموں سے افضل اور برتر سمجھنے لگی اس قسم کی شخصیت کو توڑنے کی ضرورت ہے خواہ وہ قومی شخصیت ہی کیوں نہ ہو اس لئے میں شخص کی بجائے پارٹی کو اہمیت دیتا ہوں اور ایک شخص کے کام کو اس ساری جماعت کا کام سمجھتا ہوں جس کا سردار قائد ہوتا ہے۔"(84)

مزید بیان کرتے ہیں

"میں اپنی شخصیت کے اردگرد کسی قسم کی خاندانی یا روایتی عظمت کا ہالہ نہیں دیکھنا چاہتا، میری دلی خواہش یہ ہے کہ لوگ مجھے عوام میں سے ایک فرد سمجھیں تا کہ اگر میرے خیالات اور کاموں میں انہیں کوئی بڑائی ملے تو انہیں یہ احساس ہو کہ ان کے طبقے میں سے بھی ایسے افراد پیدا ہو سکتے ہیں۔اس سے قوم کے پس ماندہ اور نچلے طبقوں میں خود اعتمادی و ہمت پیدا ہو گی۔"(85)

مولانا عبیداللہ سندھی کے اس فکر کی روشنی میں آج ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لے سکتے ہیں، کہ کس طرح شخصیت پرستی ایک بیماری کی طرح نوجوان نسل میں سرایت کر گئی ہے، اور نام نہاد لیڈران انہیں ہمہ وقت اپنی شخصیت کے سحر میں گرفتار رکھنے کے لئے خوب اپنی ذات کی خوبیاں، تقدس اور انفرادیت کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر اپنے اردگرد جمع رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان نسل سے قیادت اوپر نہ آسکی، مخصوص خاندان، یا گروہ سیاسی پارٹیوں پہ قابض ہو کر اپنی ذات کے ساتھ جمہوریت اور پارٹی کو نتھی کر دیا ہے، اگر شخصیت ہے تو پارٹی ہے اور جمہوریت ہے، اگر شخصیت نہیں تو پارٹی نہیں اور جمہوریت بھی نہیں۔نوجوانوں کے اندر نظریہ و شعور کی پختگی، اجتماعیت کی سوچ، اور اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرنے کا کوئی ماحول میسر نہیں، نوجوان چند مداریوں کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری پوری قومی زندگی سے جمہوری رویوں کا خاتمہ ہو چکا ہے، آمرانہ طرز عمل و سوچ انفرادی اور جماعتی سطحوں پہ دیکھنے کو ملتا ہے، نام نہاد جمہوری پارٹیاں جب

حکومت میں آتی ہیں تو عوامی حقوق میں عدم دلچسپی، اور قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ، کے ذریعے، آمریت ہی کی مختلف شکلوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔
مولانا عبیداللہ سندھی خود اپنی ذات کو عملی طور پہ پیش کر کے یہ سبق دیتے ہیں کہ شخصیت پرستی جمہوری رویوں کے لئے زہر قاتل، اور قومی زندگی سے تحریک اور اجتماعی جدوجہد کی اسپرٹ کو ختم کرتی ہے وہ نوجوان نسل کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اپنے اندر اعتماد پیدا کریں، اجتماعی سوچ پیدا کریں، شخصیات کو پرکھنے کا معیار نظریہ اور فکر اور کردار ہے، جماعت سازی پہ یقین اور اداروں کا احترام کریں، شخصیت کا وجود اداروں سے جڑا ہوتا ہے، شخصیت کے آنے جانے سے جماعت یا ادارے پہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے نوجوانوں کو یہ سمجھایا کہ آمریت کا راستہ شخصیت پرستی ہی سے گذر کے جاتا ہے، اگر واقعی حقیقی جمہوری فضا قائم کرنی ہے تو شخصیت پرستی کے عفریت کو معاشرے سے خیر باد کرنا پڑے گا۔

حقیقی جمہوری سیاسی پارٹی کے خدوخال

مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ فکر یقیناً اس معاشرے میں بالکل نیا تھا، جہاں جدید علوم سے غفلت برتی جارہی تھی، جہاں جمہوریت کی بجائے آمریت کا پرچار ہو رہا تھا، آپ نئے دور کے لئے ایک نیا فکر متعین کرتے ہیں اور اس فکر کی روشنی میں سیاسی نظام کی تشکیل کے لئے سیاسی پارٹی کو ضروری سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ حق کی اشاعت کرنا ہی وہ ذریعہ ہے جس سے وہ اجتماع میں پھیلتا ہے اس سے پارٹی پیدا ہوتی ہے اور ترقی کرتی ہے جب تک حق کی حمایت میں قربانی دینے والی جماعت پیدا نہ ہو جائے، اجتماع میں حق قائم ہی نہیں ہوسکتا۔" (86)

دنیائے سیاست کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی معاشروں میں

آنے والی سیاسی تبدیلیاں جماعتوں یا اجتماعی جدوجہد کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ اور سیاسی جماعتیں پورے معاشرے کو برابری کی بنیاد پہ اپنے اندر ضم کرتی ہیں۔ محنت کشوں سے لے کر امراء تک سب اس کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ نیز جب سیاسی جماعت جمہوریت کے ذریعے سے برسر اقتدار آتی ہے تو معاشرے کے ہر فرد کو رائے کی آزادی اور اس کے ہر طرح کے حقوق کا خیال رکھتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی معاشرے میں جمہوری سیاسی جماعتوں کی تشکیل دراصل اس معاشرے میں سیاسی مساوات کی عملی پیش رفت کا ذریعہ بنتی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اپنے نظریئے اور فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سیاسی پارٹی کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''یہ فکر جو ہم پیش کر رہے ہیں بالکل نیا ہے اس لئے اس کو عمل میں لانے کے لئے ایک مستقل سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے۔''(87)

آپ نے اس سلسلے میں عملی طور پہ سرو راجیہ پارٹی کا پہلا پروگرام ترکی میں ترتیب دیا، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مَیں نے استنبول میں چھ مہینے رہ کر اپنے مطالعات سیاسی کو ایک پارٹی پروگرام کی صورت میں بطور مسودہ ضبط کر لیا ہے''(88)

مولانا عبیداللہ سندھی معاشرے میں حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لئے ایسی سیاسی جمہوری پارٹی کے قیام کا نظریہ دیتے ہیں جس میں بلاتفریق تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہو سکتے ہیں، آپ نے جو سرو راجیہ پروگرام دیا اس کے مطابق ہندوستان کا ہر فرد بلا کسی تفریق کے پارٹی کا ممبر بن سکتا ہے مثلاً

مہابھارت سرو راجیہ پارٹی کے منشور کے مطابق:

''ہر ایک سرو راجیہ ملک کا باشندہ مرد وعورت بلاتفریق نسل و مذہب اپنے ملک کی سرو راجیہ پارٹی کا ممبر بن سکتا ہے۔''(89)

آپ اپنی سیاسی پارٹی کے پروگرام کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ہمیں یقین کامل ہے کہ ہندواور مسلمان ہماری پارٹی کے نمائندوں کو اپنے مشترکہ ووٹوں سے ضرور منتخب کریں گے اور مسلم نوجوان قطعی طور پر برسر اقتدار آئے گا،لیکن وہ اپنے اقتدار کو محض قانون سازی میں محدود رکھے گا کوئی قانون اکثریت کی منشاء کے بغیر اس کے احاطے میں نہیں بن سکے گا چونکہ ووٹروں کی تعلیم انسانیت کے اصول پر ہوگی،اس لئے مسلم اکثریت محض نام کی اکثریت ہوگی ورنہ حقیقت میں وہ انسانیت کی نمائندہ ہوگی ہر ووٹر اپنی صحیح تربیت یافتہ ذہنیت کے مطابق ووٹ دے گا اور اس کا نمائندہ صحیح انسانیت کے اصولوں کے مطابق اس کا دیانت کے ساتھ استعمال کرے گا۔مگر قانون چلانے میں ملک کی تمام بہترین طاقتوں کو یکساں حصہ دے گا اس میں وہ ہندو اور مسلم کا امتیاز روا نہ رکھے گا بایں ھمہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ قانون کی روح کہیں پامال نہ ہو رہی ہو۔''(90)

مزید فرماتے ہیں

''یہ پارٹی غیر مسلم عناصر کو بھی شامل کرنے کے لئے تیار ہے اس لئے دعوت فکری کے لئے وہ غیر مسلم طاقتوں کو ایک ایسے فلسفے کی طرف دعوت دیتی ہے جو مسلم وغیر مسلم دونوں کے لئے یکساں قابل تسلیم ہے۔''(91)

یہاں مولانا عبیداللہ سندھی سیاسی کام کرنے والی جماعت کے حقیقی اندرونی نظام کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ ایک جماعت اگر ملک کے تمام انسانوں کے سیاسی ومعاشی حقوق کے

لئے سرگرم ہوگی تو لامحالہ اس ملک اور قوم کا ہر باشندہ اس سیاسی جماعت میں شریک ہونے کا پورا حق رکھتا ہے، چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب، نسل، اور زبان سے ہو، ایسی ہی سیاسی جماعت جو انسانیت کے نظریئے پہ عوامی بہبود کے لئے کام کرتی ہے تو بلا تفریق پوری قوم کی امنگوں کی ترجمان ہوسکتی ہے، اور بلا تفریق انسانی حقوق کے نظام کو معاشرے میں قائم کر سکتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ''مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی'' ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی'' کے پروگرام ان ہی اصولوں پہ ترتیب دیئے تھے، جو آج بھی حقیقی جمہوری پارٹی کے لئے بہترین مینوفیسٹو کا درجہ رکھتے ہیں۔

تنظیم سازی کے عمل کی اہمیت اور طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید فرماتے ہیں

''جب انسان ایک بڑا کام کرنے کے لئے کھڑا ہوا اور وہ اس کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اس کو اپنے ہم خیال سچے رفیقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔ غرض جب رفیق جمع ہو گئے اور آپ کی پارٹی بن گئی تو اس کے بعد اس کام کی تکمیل کے لئے صحیح اور عالمگیر پروپیگنڈے کی سخت ضرورت ہے، اسے اشاعت اور دعوت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے آج کل ڈپلومیسی میں جھوٹ کا لفظ بھی شامل کر دیا گیا ہے مگر صحیح پروپیگنڈے میں اس جھوٹ کی مطلقاً اجازت نہیں ہے اور اسے لوگوں نے خواہ مخواہ غلطی سے مشہور کر دیا ہے کہ اس میں جھوٹ کی اجازت ہے۔''(92)

یہاں تنظیم سازی کے لئے جھوٹ کا سہارا لینے کو منع کیا گیا ہے جیسا کہ آج ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے، سیاست کی پہچان ''جھوٹ'' بن کر رہ گئی ہے، جو سب سے زیادہ اور بہتر جھوٹ بول سکتا ہے وہ منجا ہوا سیاستدان کہلاتا ہے، پیشہ ور گروہ سیاستدان بن کر عوام اور جمہوریت کے نام پہ ایسا کھیل کھیل رہے جس سے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں جھوٹ کی بنیاد پہ سیاست، جھوٹ کی بنیاد پہ الیکشن، جھوٹ کی بنیاد پہ الحاق کر کے حکومتیں

تشکیل دینا،اس طرح جمہوریت کے نام پہ عوام کا استحصال ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ لوگ جمہوریت ہی سے عاجز آ چکے ہیں۔

سیاسی عمل میں شخصیت پرستی کا پرچار کرنے کی بجائے،سیاسی پارٹی کی تشکیل میں پارٹی کے پروگرام اور نصب العین کا پرچار ہونا ضروری ہے تا کہ ورکرز نصب العین کو واضح طور پہ سمجھیں اوراس کے ساتھ جڑیں رہیں،کیونکہ واضح نصب العین کے بغیر افراد کو ایک پارٹی میں منظّم رکھنا مشکل ہوتا ہے،مولانا عبیداللہ سندھی اس پہلو کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''وہ نصب العین یا مقصد جسے ایمان بنالیا گیا ہے بالکل صاف،واضح اور معین ہونا چاہئے کیونکہ اسی صورت میں افراد پارٹی میں شامل ہو کر متحدہ طور پر کام کر سکتے ہیں۔اگر نصب العین معین نہ ہوتو ہر شخص اپنے اپنے مطلب کے معنی لے گا اور وہ نصب العین ہی جماعت (پارٹی) کے انتشار فکر کا باعث بن جائے گا۔تاریخ اس امر کی بیسیوں مثالیں پیش کرسکتی ہے کہ نصب العین واضح نہ ہونے کے سبب سے پارٹی ہمیشہ اختلافات کی آماجگاہ بنی رہی اور وہ اپنے نصب العین کو عمل میں نہ لاسکی۔۔۔۔۔کوئی نصب العین جتنا واضح اور معین ہوگا اتنا ہی اس پر ایمان لانے والے اس کی خاطر جان دینے پر زیادہ آمادہ ہوسکیں گے اور جتنا غیر معین اور مبہم ہوگا اتنا ہی فرار کی راہیں کھلیں گی اور لوگوں کو جان و مال بچانے کا موقع ملے گا ظاہر ہے کہ جس تحریک میں جان و مال بچانے کا موقع مل جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نصب العین تو معین ہے لیکن بعض وہ ارکان جو اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے دلوں میں کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر کچھ کرتے ہیں یہ لوگ منافق کہلاتے ہیں وہ مشکل ہی سے کامیاب ہوتے ہیں ۔انقلاب کی مرکزی جماعت (سنٹرل کمیٹی) کا فرض ہوتا ہے کہ انقلابی پروگرام کی ترجمانی میں ایسے لوگوں کو داخل نہ کرے اور کوئی داخل ہو چکا ہوتو اسے جس طرح بھی ممکن ہو غیر مؤثر بنادے۔بعض اوقات کم

علم یا جاہل ارکان بھی نصب العین کے مبہم بنانے میں حصہ لیتے ہیں ان کی تعلیم کا پورا پورا بندوبست ہونا چاہیئے تا کہ یہ لوگ نصب العین کے متعلق صحیح علم حاصل کریں اور لاعلمی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے نہ پھریں۔ان دونوں صورتوں میں یعنی منافقوں اور جاہلوں کی موجودگی میں ساری جماعت کی علمی قوتیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہوسکتیں۔اس لئے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ان دونوں کا انسداد ضروری ہے۔"(93)

اس تناظر میں آج سیاسی پارٹیوں کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، کہ کس طرح عام کارکن اور قائدین میں فرق برتا جاتا ہے، سیاسی تربیت کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کارکنوں کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں ہوتا، یعنی وہ جاہل ہوتے ہیں، اور وہ اس بے شعوری میں فردواحد یا ایک مخصوص مفاد پرست ٹولے کے مفادات کے لئے استعمال ہوجاتے ہیں، اس طرح عام کارکن کو بے شعور رکھ کر اس سے فقط نعرے لگوانے اور اسے استعمال کرنے کا کام لیا جاتا ہے، نیز سیاسی مقاصد کا واضح تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہر جاہل کارکن اپنی اپنی پالیسی بیان کرتا پھرتا ہے، جس سے ان پارٹیوں میں ہمہ وقت انتشار کی فضا رہتی ہے، اس طرح مفاد پرست لوگ پارٹیوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں، جہاں ان کو فائدہ نظر آتا ہے فوراً پارٹی بدل دیتے ہیں، اس طرح ایک ایسا منافقانہ کلچر معاشرے میں عروج پا چکا ہے جس کے تحت فقط اپنے مفادات کے تحفظ کی سیاست ہوتی ہے۔لہذا مولانا عبیداللہ سندھی مفاد پرستوں اور جاہلوں کو کسی پارٹی کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی جلاوطنی کے دوران افغانستان، روس اور ترکی میں سیاسی تبدیلیوں کے حوالے سے جماعتوں کے کردار اور جماعت سازی کے طریقہ کار کا خصوصی مطالعہ کیا، اور سیاسی پارٹی کے نظاموں اور حکومتوں کی تبدیلیوں میں افادیت واہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے گذشتہ طرز عمل پہ نظر ثانی کی اور عصری تقاضوں کے مطابق سیاسی پارٹی

کی تشکیل اوراس کے ارتقاء کے لئے اپناذہن بنالیا۔اگر چہ مولانا اول دن سے ہی جماعت سازی کے بغیر کسی بھی عمل کو درست نہیں سمجھتے تھے۔اور جب وہ آزادی کی جدوجہد کے لئے نکلے تو اس وقت بھی جو طالب علم ان کے ساتھ تھے۔وہ انہیں مختصر جماعت ہی کہتے تھے۔اور خود مولانا شیخ الہند کی جماعت کے فرد کے طور پہ کام کے لئے نکلے تھے۔اور آگے چل کر افغانستان میں کانگریس کی شاخ بنانے میں بھی یہی جماعت سازی یا جماعت کے ساتھ تعلق کے ذریعے سیاسی کام کی حکمت کارفرما تھی۔آپ بیان کرتے ہیں

''ہم نے یورپین انقلابی پارٹیوں کے نظام کا کافی مطالعہ کیا ہے اس سے ہمارے دماغ میں سیاسی پروگرام بنانے اور سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوگیا ہے ہم اگر امام ولی اللہ کی خلافت باطنہ کے فکر کو آج کے سیاست دانوں کے سامنے پیش کریں گے تو اسے انقلابی پارٹی کا نام دیں گے جو عدم تشدد(نان وائلنس) کی پابند ہو۔''(94)

یہاں آپ نے یورپ کی سیاسی پارٹیوں کے نظام کے مطالعے کا ذکر کیا ہے اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد سیاسی پروگرام بنانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی،اس حوالے سے وہ دور جدید کے سیاسی جماعت کے سیٹ اپ کو سمجھانے کے لئے''شاہ ولی اللہ کی خلافت باطنہ'' کے فکر کا حوالہ دیتے ہیں تا کہ ہندوستان کے مروجہ ماحول میں اس کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو،اگر خلافت باطنہ کو آسان الفاظ میں بیان کریں تو جماعت کے اندر وحدت فکری ووحدت عملی کہا جاسکتا ہے، جہاں جماعت کے تمام افراد ایک جسم کی طرح کام کرتے ہیں اور اپنے منتخب کردہ امیر کے حکم کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ ''عدم تشدد'' کی طرف اشارہ کیا ہے، کسی بھی سیاسی جمہوری پارٹی جو کہ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔وہ افراد کی تربیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی،اور تربیت کے لئے ایک وقت درکار ہوتا،ایک تربیتی نظام درکار ہوتا،اور پھر سیکھنے والوں کی بھرپور توجہ

درکار ہوتی ہے، سیکھنے اور سکھانے کا یہ عمل اس وقت ہی پروان چڑھ سکتا ہے جب اس کا جذبات وتشدد سے کوئی لینا دینا نہ ہو،لہذا عدم تشدد پہ کار بند رہ کر ہی تربیتی نظام کے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔لہذا یہاں مولانا عبیداللہ سندھی یورپ کی جمہوری سیاسی پارٹیوں کی طرز پہ ایک سیاسی تربیت یافتہ پارٹی بنانے کا تصور دیتے ہیں۔

سیاسی جدوجہد کرنے والی جماعت جب سیاسی نظام قائم کرتی ہے تو اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اگر کسی طرح حکومت چھن بھی جائے تو جماعت قائم رہتی ہے۔لہذا سیاسی عمل میں اور حکومتوں کی تبدیلیوں کے لئے سیاسی جماعت کی بہت زیادہ اہمیت ہے لہذا آپ کے نزدیک ''پارٹی کا نظام مستقل ہوتا ہے،حکومت کبھی بنتی ہے کبھی ٹوٹتی ہے۔پارٹی کا وجود اس وقت تک سالم مانا جاتا ہے۔جب تک اس کی اساسی مصلحت قائم کرنے والی جماعت فنا نہیں ہوتی۔''(95)

یعنی آپ سیاسی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سیاسی پارٹی کو ضروری قرار دیتے ہیں، اوراس کی مستقل حیثیت کو بیان کرتے ہیں،یعنی سیاسی پارٹی ایک نظریئے پہ قائم ہوتی ہے، اور جب وہ سیاست کے میدان میں آتی ہے تو کبھی وہ کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ناکام ہوتی ہے،اس کی کامیابی یا ناکامی سے اس کے نظریئے یا اس کے مستقل وجود پہ کچھ اثر نہیں پڑتا، لیکن وہ اس وقت فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے جب اس کی نظریاتی اساس قائم کرنے والے جماعت ختم ہوجاتی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی جب جماعت یا پارٹی کی بات کرتے ہیں تو وہ حقیقی جمہوری پارٹی کے تمام لوازم کو ضروری قرار دیتے ہیں، وہ اس تناظر میں کسی قسم کی آمرانہ روش یا رویئے کو قبول نہیں کرتے۔وہ اس ذہنیت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی بدولت یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ پارٹی کا لیڈر ڈکٹیٹر ہوتا ہے بلکہ آپ پارٹی کو شخصیت سے بالا سمجھتے ہیں اور پارٹی

کی ڈکٹیٹر شپ کی بات کرتے ہیں آپ کا کہنا تھا ''کوئی انقلاب پارٹی آمریت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔'' (96)

مولانا عبیداللہ سندھی سیاسی جماعت کو جہاں ناگزیر سمجھتے ہیں وہاں اس جماعت کے اندر بھی جمہوری رویوں کو ضروری قرار دیتے ہیں، کیونکہ ایک سیاسی جماعت جب معاشرے میں جمہوریت کے قیام کے لئے جدو جہد کرتی ہے تو لازمی ہے کہ اس کے اراکین بھی جمہوری قدروں سے آشنا ہوں نیز جماعت کے اندر بھی جمہوری نظام موجود ہونا ضروری ہے۔ جماعت کے اندر شخصیت کی بالادستی کی بجائے اداروں کی بالادستی ہونی چاہئے۔ اور رفتہ رفتہ اراکین جماعت کے ادارے بنانے ضروری ہیں۔ تاکہ فرد کی بجائے تمام فیصلہ جات اداروں کے ذریعے ہوں اور قائد و کارکن سب یکساں ان کے پابند ہوں۔ ہمارے معاشرے میں اکثر جماعتیں اسی قسم کی خامیوں کا شکار ہیں۔ بظاہر تو وہ جمہوری قدروں، جمہوری نظام کی مضبوطی اور جمہوریت کے استحکام کی باتیں کرتی ہیں لیکن ان کے اندرونی نظام میں شخصی آمریت موجود ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتیں شخصیات یا خاندانوں کی بنیاد پہ کھڑی کی جاتی ہیں اور ایک لیڈر جب پارٹی کی قیادت چھوڑتا ہے تو اس کا بیٹا یا اس کا خاندانی وارث اس گدی کو سنبھال لیتا ہے۔ جمہوری نظام کا حسن مشاورت ہے اور یہ ہر رکن کے رائے کی آزادی اور اس کی اہمیت پر مبنی ہوتا ہے۔ جہاں مشاورت کا عمل نہ ہو اور رائے کی آزادی نہ ہو وہ سیاسی گروہ تو کہلائے جا سکتے ہیں سیاسی جماعت نہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ہندوستان میں سیاسی کام کرنے والی جماعتوں میں اسی وجہ سے مذہبی رسومات کے دخل کو منع کیا اور ان کی کانگریس پہ تنقید بھی اسی وجہ سے تھی۔ بقول ان کے'' کانگریس کو خالص ایک سیاسی جماعت قرار دیں اور اقتصادیات کو سیاسی زندگی کی بنیاد سمجھیں۔'' (97)

ایک زمانے میں کانگریس کا رویہ متعصّبانہ ہونا شروع ہوگیا، ہندوستان بھر میں مسلمانوں

کو اقلیت میں بدلنے کے لئے انہوں نے مختلف کوششیں شروع کر دیں لہذا اس کے غیر قومی اور ارتجاعی رویئے کی بدولت مسلمانوں کی جماعتیں اس سے دوری اختیار کرتی گئیں اور اس کے خلاف ایک محاذ وجود میں آ گیا۔ خطبہ صدارت جمعیت علمائے سندھ اکتوبر 1939ء (جو کہ پڑھا نہیں گیا) اس میں مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں

''کانگریس کے اس دور میں جو تحریک خلافت کے ختم سے شروع ہوتا ہے مہاتما گاندھی کی رہنمائی سے ہندو سوسائٹی کا ایک خاص فلسفہ اور خاص ارتجاعی پروگرام بالتدریج کانگریس پہ قبضہ کر رہا ہے اس سے تنہا مسلمان ہی نالاں نہیں، ہندوؤں کی ترقی پسند سیاسی جماعتیں بھی ناراض ہیں، یہ پارٹی پرانے مذہب کو زندہ کرنے کے دعویٰ سے ہندو مہا سبھا اور سیاسی رشوتوں سے ترقی کن نوجوانان پارٹی کو اپنے ساتھ چلا رہی ہے'' (98)

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب مذہبی رسومات سیاسی جماعت میں گھر کر جاتی ہیں تو لامحالہ ان میں رجعت پسندی کے ساتھ شخصیات کا تقدس اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ کارکنوں کو جرات سوال نہیں ہوتی اور سیاسی اور جمہوری عمل کے لئے جس آزادی اظہار رائے کی ضرورت ہوتی ہے وہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہذا مولانا عبیداللہ سندھی نے سیاسی مساوات کے قیام کے لئے اس حکمت عملی کو اختیار کرنے کی دعوت دی اور سیاسی اداروں میں مذہبی رسومات داخل کرنے کی ممانعت کی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں

''وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ سیاسی اور سماجی معاملو ں میں خواہ مخواہ مذہب کو استعمال کیا جائے اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔ ان کے خیال میں سیاسی وسماجی مسائل کے حل کے لئے جس نقطہ نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ مذہبی جذباتیت میں نہیں مل سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ یا تو مذہبی جذبات ذہن وعقل پر غالب آجاتے ہیں اور محض جذبات ہمیں کسی صحیح نتیجے تک پہنچانے میں مفید ثابت نہیں ہوتے۔"(99) گذشتہ بحث کا خلاصہ یہ سامنے آیا کہ مولانا عبیداللہ سندھی چاہتے تھے کہ:

☆ نوجوان نسل پہ اعتماد کیا جائے اور انہیں ذہنی مایوسی سے نکالا جائے

☆ نوجوان نسل میں شخصیت پرستی کی بجائے اجتماعی جدوجہد کی سوچ کو پروان چڑھایا جائے

☆ حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لئے حقیقی جمہوری سیاسی پارٹی تشکیل دی جائے۔

☆ سیاسی پارٹی کی تشکیل میں مذہبی رسومات کو داخل نہ کیا جائے

☆ سیاسی پارٹی بلاتفریق تمام افرادِ معاشرہ کی نمائندہ ہو، اور سب کو اس کا ممبر بننے کا حق ہو

☆ سیاسی پارٹی کی تشکیل کے لئے دعوتی عمل میں جھوٹ کا سہارا نہ لیا جائے

☆ تمام کارکنان کی رائے کا احترام واہمیت دی جائے

☆ سیاسی پارٹی کا اندرونی نظام جمہوری رویوں کا آئینہ دار ہو

☆ سیاسی پارٹی کا نصب العین واضح ہو، اور قائدین اور کارکن اس سے یکساں آگاہ ہوں

☆ جمہوری سیاسی پارٹی عدم تشدد کی پابند ہو، تاکہ نوجوانوں کی سیاسی ونظریاتی تربیت کا اہتمام کیا جاسکے۔

☆ جمہوری سیاسی پارٹی کا پروگرام اور تربیتی نظام عصری تقاضوں سے مکمل طور پہ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

باب چہارم

جمہوریت کے قیام کے لئے پسماندہ طبقات کی تربیت

مولانا عبید اللہ سندھی معاشرے میں جمہوری نظام کے قیام کے لئے جہاں نوجوان نسل کی تربیت کو اہمیت دیتے تھے، اور خاص طور پڑھے لکھے نوجوانوں کو قیادت کے لئے تیار کرنے پہ زور دیتے تھے وہاں وہ جمہوریت کے قیام میں سب سے اہم ترین کردار معاشرے کے عام پسماندہ طبقات کا قرار دیتے تھے۔ آپ کے سیاسی پروگرام میں سب سے زیادہ اہمیت معاشرے کے پسماندہ طبقات جن میں مزدور و کسان و دیگر محنت کش افراد شامل ہیں کو حاصل ہے، کیوں کہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ان ہی کے ووٹ سے جمہوری نظام کے قیام کی صورت بنتی ہے، ہندوستان میں اُس وقت محنت کش و کسان طبقہ انتہائی خستہ حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ پسماندگی اور بدحالی اس وجہ سے زیادہ تھی کہ یہ طبقہ اپنے حقوق سے عدم آگاہی اور سیاسی شعور سے محروم تھا۔ جاگیرداروں کے زیرِ سایہ ان کا استحصال زوروں پہ تھا۔ انگریزوں کے حاشیہ برداروں نے انہیں جانوروں سے بدتر زندگی پہ مجبور کر رکھا تھا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح یورپ میں محنت کشوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے اوران کی حالت اچھی ہوگئی ہے اسی طرح ہندوستان کے محنت کشوں کی حالت کو بھی بہتر ہونا چاہئے۔ لہذا آپ کا کہنا تھا ”جہاں تک میرا تعلق ہے میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد قوم کے نچلے

طبقوں کو اوپر لانا ہے میں اونچے طبقوں کے تمدن، آداب اور لطافت کا سخت مخالف ہوں۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ اور خدا نے کیا تو میں اس کو پورا کر کے چھوڑوں گا۔"(100)

آپ اپنے سیاسی منشور میں واضح کرتے ہوئے بیان کیا ہے

(الف) ملک کے بڑے طبقوں یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کشوں (Poor Intelectuals) کو چھوٹی صنفوں یعنی زمیندار اور سرمایہ دار کی جمہوری گورنمنٹ کے ہر ایک شعبہ میں نمائندگی کا حق ان کی تعداد کے مطابق دے کر اسے محفوظ کر دیا جائے۔"(101)

مولانا عبیداللہ سندھی ایک حقیقی جمہوری نظام کو قائم دیکھنا چاہتے تھے۔ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اپنی پہلی سیاسی پارٹی کا نام "مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی" رکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں عوامی حکمرانی چاہتے تھے۔ ان کی اس پارٹی کا پروگرام پورے ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیتوں اور مذاہب کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس پارٹی کے منشور میں جہاں دیگر حقوق کی ضمانت فراہم کی گئی ہے وہاں سیاسی حقوق کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی کیا گیا ہے، اور سیاسی مساوات یعنی ہر شہری کو سیاسی عمل میں شرکت کا حق دیا گیا ہے۔ سرو راجیہ منشور کی دفعہ نمبر 18 کے مطابق:

"ہر ایک سرو راجیہ جمہوریہ میں

(الف) کسانوں اور ان سے تعلق رکھنے والے پیشہ وروں کی "کسان سبھائیں"

(ب) فیکٹری اور کارخانہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی "انجمن ہائے مزدوراں"

(ج) دفتروں اور تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کی "محافل محنت کشاں دماغی"

بنانے کا ناقابل تنسیخ حق محنت کش طبقہ کو حاصل ہوگا۔ ان مجالس کے توسط سے وہ لوگ اپنے مطالبات پیش کریں گے اور انتخابات میں حصہ لیں گے۔ محنت کش طبقہ کو حکومت سے

ناراض ہونے کی صورت میں بھی ان مجالس کے فیصلے پر ہڑتال کرنے کا حق حاصل ہوگا۔
دفعہ نمبر 19 (الف) میں لکھا ہے "ہر عاقل بالغ مرد وعورت کو جو کسی اخلاقی جرم میں سزا یاب نہ ہو چکا ہو، اس پنچایت کے انتخابات میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔
(ب) کسانوں، مزدوروں، اور دماغی محنت کشوں کو اپنی سبھاؤں، انجمنوں اور محفلوں کے توسط سے اپنے تناسب آبادی کے مطابق نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہوگا۔
(ج) سوسائٹی کی دوسری جماعتوں یعنی زمیندار، ساہوکار، سرمایہ دار اور تاجر کو ان کی آبادی کے مطابق حق نمائندگی ملے گا۔ کسی صورت میں بھی اس کی اہمیت کی بناء پر ان کو تناسب آبادی سے زیادہ حق نمائندگی نہیں دیا جائے گا۔" (102)

مذکورہ بالا نکات میں مولانا عبیداللہ سندھی نے جو اہم باتیں بیان کی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ معاشرے کے محنت کش طبقات میں تنظیم سازی کا عمل انتہائی ضروری ہے۔ یعنی ان کی تربیت کا آغاز چھوٹی چھوٹی اجتماعیّتوں سے ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے وہ ان طبقات مثلاً مزدوروں، دیگر محنت کشوں کی تنظیمیں بنانے کی تجویز دیتے ہیں، اور یہ تنظیمیں اپنے اپنے مسائل کو اجاگر کرنے کے لئے سیاسی پارٹی کے اندر شامل ہوں گی۔ اور پھر آگے چل کر جب حکومتی اداروں میں شریک ہوں گی تو محنت کشوں کے حقوق کی ضامن ہوں گی۔ اسی طرح آپ کسانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعت بندی کا پروگرام دیتے ہیں جو کہ سیاسی شعور سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مسائل کے حل اور اپنے حقوق کے لئے بہتر انداز سے پارلیمنٹ میں نمائندگی کی صلاحیت حاصل کر سکیں گی۔ کسانوں کو سیاسی تربیت دے کر ان میں تنظیم پیدا کرنے کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں "ہم کسانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں انہیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔" (103)

مزید بیان کرتے ہیں کہ

''ہم کسان کے لئے سب کچھ چاہتے ہیں، لیکن ہم اس کو زمیندار سے ٹکراتے اور لڑاتے نہیں، ہمارے ملک میں زمیندار کا آج ایک درجہ ہے۔ وہ زمین کا لگان کسانوں سے وصول کر کے حکومت کو پہنچاتا ہے۔ جب ہم حکومت سے نہیں لڑتے تو کسان کو اپنے زمیندار سے کیوں لڑائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح اسمبلی میں جا کر زمینداروں سے کسانوں کے حقوق لئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری خاص بات ہے اور اسی لئے ہم اپنی ایک مستقل سیاسی پارٹی بناتے ہیں، ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں ہیں۔'' (104)

سیاسی پارٹی کے منشور میں محنت کش طبقات کی سیاسی تربیت کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

''ہر سرو راجیہ کانفرنس کا اصلی اور اہم کام اپنے ملک کی سرو راجیہ جمہوریہ پیدا کرنا ہے اس لئے وہ محنت کش طبقات کو سیاسیات کی تعلیم دے گی۔ ان کی تنظیمات اس طرح درست کرے گی کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کے ہر ایک شعبہ میں اپنی تعداد نفوس کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔'' (105)

اس طرح محنت کشوں کی جدو جہد کو ہی آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے آپ رقمطراز ہیں کہ ''مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی ہر ایک ہندوستانی ملک کے محنت کش طبقہ کی جدو جہد پر اس ملک کی آزادی کو منحصر سمجھتی ہے۔'' (106)

مولانا عبید اللہ سندھی ایسے سیاسی لیڈروں کو جو کہ خواص پسندی میں مبتلا ہیں اور جنہیں عوام میں جانے اور ان کے درمیان رہ کر ان کے مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کے لئے جدو جہد کی فرصت نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ محنت کشوں کے مسائل اور ان کے حقوق کو اہمیت دیتے ہیں کے بارے میں فرماتے ہیں ''ہمارا یہ طبقہ عوام کی قیادت کرنے کی صلاحیت کھو چکا

ہے۔کیونکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موجودہ سماجی بلند مقام سے نیچے اتریں،عوام میں جائیں ان کے سے بن کر ان کی قیادت کریں اس کے بغیر ممکن نہیں،لیکن ہمارے اعلیٰ طبقے کے یہ بس میں نہیں۔"(107)

یہی کیفیت آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے، جہاں نام نہاد جمہوریت کے علمبردار سیاسی لیڈر محنت کشوں، کسانوں کے حقوق پہ یکسر توجہ نہیں دیتے، کسانوں اور مزدوروں سے ووٹ مانگنے جاتے ہیں لیکن ان کی تعلیم، صحت، و دیگر حقوق پہ کوئی دھیان نہیں دیتے۔اس طرح اس وقت کسانوں اور مزدوروں کی حالت زار دن بدن بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی چاہتے تھے ان کے ہاں بھی کسان اور مزدور کی حیثیت وہی ہو جائے جو کہ یورپ کے مزدوروں کی ہے،یعنی ان میں بھی ایسی سیاسی تنظیم وجود میں آئے،ان کی بھی اس طرح کی تربیت کی جائے کہ وہ منظّم ہو کر اپنے حقوق حاصل کریں جیسے یورپ میں ہو رہا ہے۔لہذا وہ پر امید تھے کہ مزدور ضرور مشینوں کے ذریعے منظّم ہو کر پارلیمانوں میں پہنچیں گے۔آپ کے بقول "اس ترقی یافتہ یورپ کو ہم ایک مصیبت میں دیکھتے ہیں۔یورپ کی جس قدر قومیں جمہوریت پسند ہیں۔اور مشین کے استعمال سے دنیا پر برتری حاصل کر چکی ہیں اگر ان کی پارلیمنٹ میں محافظین اور لبرل کی اکثریت ہے تو ان قوموں کو ایک خطرناک انقلاب ڈرا رہا ہے۔ان کی پارلیمنٹ میں کاریگروں کو غلبہ ہو کر رہے گا۔چونکہ یہ کاریگر اور مزدور ایک طویل زمانہ سے کنزرویٹو اور لبرل کے ظلم کا شکار ہوتے رہے ہیں،اس لئے ان سے انتقام کا جذبہ مزدوروں میں پیدا ہونا ضروری ہے۔"(108)

لہذا مزدور طبقہ کے ساتھ ساتھ کسانوں میں بھی تنظیم کی اہمیت بیان کرتے ہیں، کیونکہ مزدور جب مشینوں پہ کام کریں گے اور کارخانوں میں اپنے آپ کو منظّم کر لیں گے اور اپنے حقوق کے لئے میدان عمل میں آئیں گے تو کسان بھی اپنے آپ کو منظّم کر کے ان کا ساتھ دیں گے

آپ فرماتے ہیں

"جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے انقلاب پیدا کریں گے اس وقت اگر ملک کے کاشت کار بھی منظّم ہو چکے ہوں تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔"(109)

ووٹ کی اہمیت اور استعمال

یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس کے مطابق "ووٹنگ تمام شہریوں کا بنیادی حق ہے جن کی عمریں اٹھارہ سال ہو چکی ہیں۔" یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسان اس جگہ رہنا نہیں چاہتا جہاں اس کے نقطۂ نظر یا خیالات کو اہمیت نہ دی جائے۔ جیسا کہ آزاد اور غلام انسان میں فرق ہوتا ہے آزاد انسان اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور خود سے سوچ کے فیصلہ کر سکتا ہے جب کہ ایک غلام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ووٹنگ آزاد اور غلام قوم میں تفریق کرتی ہے۔ اگر ایک قوم ووٹنگ کے حق سے محروم ہے تو یہ طے ہے کہ وہ آزادی اظہار رائے کے حق سے محروم ہے، اور اسے آزاد قوم نہیں کہہ سکتے۔۔

ووٹنگ صرف جمہوریت کے لئے اہم ہی نہیں بلکہ خود جمہوریت ہے۔ کوئی بھی جمہوری نظام بغیر شہریوں کی مدد اور ووٹ کے نہ چل سکتا ہے اور نہ مضبوط ہو سکتا ہے۔ جب جمہوریت کی تعریف کی جاتی ہے تو ووٹنگ کو اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ ووٹنگ کا عمل شہریوں کی طرف سے امیدواروں کے لئے اظہار رائے ہے۔ جس کی بدولت وہ حکومت کے اداروں کی تشکیل میں دخیل ہوتے ہیں۔ منتخب ہونے والے امیدوار شہریوں کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں، اس عمل سے سے اقلیت کی اجارداری کو کنٹرول کیا جاتا تا کہ وہ اکثریت کے حقوق پامال نہ کر سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ووٹنگ کا حق شروع میں صرف امراء اور جاگیرداروں کے لئے تھا، بعدازاں

اس حق کو مزید تبدیل کرتے ہوئے صرف مردوں کو یہ حق دیا گیا چاہے وہ کسی طرح کی جائیداد کے مالک نہ ہوں۔لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی یہ حق دے دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلیاں اس وجہ سے آئیں کہ لوگوں نے ووٹ کا استعمال بند نہیں کیا،یقیناً آج کے دور میں مال وجائیداد کے ذریعے الیکشن جیتنے کا رواج اور رجحان موجود ہے،لیکن ایک مسلسل جمہوری عمل لوگوں کو جرات اظہار دیتا ہے،اور وہ امراءاور جاگیرداروں کے سرمایہ سے مرعوب نہیں ہوتے، بلکہ اپنے اجتماعی حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔

ووٹنگ جمہوری معاشرے میں لوگوں کو غیر فعالیت سے نکال کر فعال بنانے کا ایک اہم آلہ ہے اسی آلے کی مدد سے لوگوں میں تنظیم اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے، جو قوم زیادہ سے زیادہ ووٹنگ میں حصہ لیتی ہے وہ اجتماعی طور پہ مضبوط سے مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے،اور پھر وہ اپنی عوامی طاقت سے ظالموں کے تختے الٹ دیتی ہے۔۔ایک مفکر کا قول ہے کہ ”طاقت اقلیت کے ہاتھوں کی بجائے تمام لوگوں کے پاس ہو“ ووٹنگ اور جمہوریت ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے طاقت تمام لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔

لہذا اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے عبیداللہ سندھی عوام کو ووٹ کی اہمیت کے حوالے سے تربیت دینا ضروری قرار دیتے ہیں، جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے پروگرام میں اساسی اصول(2)(د،ہ) میں واضح کرتے ہیں کہ

”ہر مرد و عورت کا مساوی حق ماننا اور جمہوری نظام پر فوقیت کو ترقی دینا،نسل ،مذہب اور قدامت کو تفوق کا ذریعہ نہ بنانا۔ایک ہندوستانی ملک کی عام آبادی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دے کر ووٹ کی قیمت سمجھانا۔“(110)

جمہوری عمل میں معاشرے کے عام طبقات کو شریک کرنے کے لئے ووٹ کا شعور انتہائی

ضروری ہوتا ہے مولانا عبیداللہ سندھی اس کی اہمیت سمجھتے تھے لہذا وہ اپنے سیاسی پروگرام جس کا آغاز وہ سندھ سے کرتے ہیں میں لکھتے ہیں کہ ''میری پارٹی کا پہلا مرکز کراچی ہے۔ یہاں سے میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک سندھی کو لکھنا پڑھنا سکھلاؤں، اسے نیشنل تعلیم دے کر اپنے ووٹ کو صحیح استعمال کرنے کا طریقہ بتلاؤں۔ یہ میرا پہلا قدم ہے۔''(111)

مزید لکھتے ہیں کہ

''ہم سندھ کے عام باشندوں کو ووٹ کی قیمت بتانا چاہتے ہی اور اس طرح اسمبلی میں عوام کی طاقت مرکز کرنے میں مساعی ہیں۔''(112)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں

''مولانا سندھی کے منشور میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی تھی کہ ان کی جماعت ہندوستان میں محنت کش طبقہ (کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں) کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرے گی۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ملک کے 87 فیصد عوام کاشتکار تھے لیکن ان کا ایک بھی نمائندہ اسمبلی میں نہیں ہوتا تھا۔ان کے ووٹ وڈیرہ یا زمیندار حاصل کر کے اسمبلی میں پہنچ جاتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔اسمبلی میں جا کر وہ اپنے ووٹروں کے مفاد کی بجائے اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کرتا تھا۔ ہمارے ہاں آئے دن اخبارات میں ایسے بیانات چھپتے رہتے ہیں کہ ملک کے بائیس لاکھ کلرک قلم چھوڑ ہڑتال کریں گے یا اپنے مطالبات منوانے کے لئے احتجاجی مظاہرے میں حصہ لیں گے۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان بائیس لاکھ کلرکوں کا کوئی نمائندہ قومی یا صوبائی اسمبلیوں میں موجود نہیں ہے۔ یہی حال مزدوروں، دوکانداروں اور اہل حرفہ کا ہے۔ مولانا سندھی فرماتے تھے کہ یہ طبقے اپنے ہی طبقے سے اپنے نمائندے منتخب کریں جو اسمبلی میں جا کر ان کے مفادات کی حفاظت کریں۔ جب تک ان کے اپنے نمائندے اسمبلیوں میں نہیں جائیں گے۔ان کے حقوق

یونہی پامال ہوتے رہیں گے۔ مولانا فرماتے تھے کہ تعداد کے اعتبار سے سرمایہ دار، زمیندار اور وڈیرے ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ لیکن اسمبلیوں میں یہی عوام کے نمائندے بن کر جاتے ہیں۔ یہ اپنے طبقے کے نمائندے تو ہو سکتے ہیں کسانوں، مزدوروں اور دماغی کام کرنے والوں کی نمائندگی کے حقدار نہیں ہیں۔ اس لئے ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے جو تین چار نشستیں ان کے حصے میں آتی ہیں وہ انہیں دے دی جائیں۔ جب تک پس ماندہ اور غریب طبقوں کے نمائندے اسمبلیوں میں نہیں جائیں گے ان طبقوں کے نہ تو مسائل حل ہوں گے اور نہ ہی ان کی حالت بہتر ہوگی۔ اگر بر وقت اس مسئلے کا حل تلاش نہ کیا گیا تو یہ ملک میں بہت بڑے خونی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔" (113)

ابوسلمان شاہجہان پوری مزید لکھتے ہیں کہ

"آج ہمارے ہاں اسمبلیوں کے انتخابات میں ایک امیدوار کا خرچ کروڑوں روپے تک ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اور نکلا ہے کہ صرف ارب پتی اور کروڑ پتی صنعت کار اور زمین دار ہی اسمبلیوں میں نمائندے بن کر بیٹھیں گے اور ملک کی آبادی کا سب سے بڑا طبقہ کسان، مزدور، کلرک اور چھوٹے دوکاندار صحیح نمائندگی سے محروم رہیں گے۔ مولانا سندھی نے ایسے امیروں پر پچاس فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی تھی۔" (114)

مولانا عبیداللہ سندھی قوم کے اعلیٰ طبقات کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں یہ باور کرواتے ہیں کہ وہ اپنی سطح سے نیچے آ کر قوم کے محنت کش اور پسماندہ طبقوں کے ساتھ تعلق بنائیں۔ ان سے دوریاں پیدا نہ کریں ان کے مسائل کو سمجھیں اور جو طبقاتی فضا ہے اس کو ختم کریں۔ اس سے پسماندہ طبقے میں اعتماد بڑھے گا اور وہ سیاسی عمل میں شرکت کے ساتھ ساتھ تنظیم کو مضبوط کریں گے۔ آپ کا کہنا تھا

''ہماری قوم کا اعلیٰ طبقہ عموماً برباد ہو چکا ہے۔ بجز ان چند نیک بندوں کے جو پسماندہ جماعت کے اٹھانے میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اسی نظام کو ہم جمہوری مانتے ہیں۔ نکمے مالداروں اور رہبانیت سکھانے والے عالموں کا اس نظام میں کوئی دخل نہیں۔''(115)

ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ نے یونانی فلسفی افلاطون کی کتاب ''ریاست'' کا اردو میں ترجمہ کیا، اور اس پہ مقدمہ لکھا۔ اس مقدمہ کو عبید اللہ سندھی نے بہت غور سے پڑھا اور اس پہ اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا

''ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ پڑھ کر میں نے یوں محسوس کیا کہ ہمارے ہاں کے اعلیٰ طبقے کچھ مایوس سے ہیں۔ یہ اور اوپر جانے سے تو رہے کیونکہ موجودہ حالات میں اس کا کوئی امکان نہیں نیچے طبقوں میں جانا ان کی طبیعت کے خلاف ہے، مجبوراً یہ افلاطون کی طرح عینیت پسندی میں تسکین ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آج اس دور میں اصل کرنے کا کام عوام میں جا کر اور ان کی سطح پر رہ کر ان کی رہنمائی کرنا ہے جیسے دنیا کے دوسرے ملکوں کی انقلابی قیادتیں اپنے ہاں یہ کام کر رہی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے اس مقدمے نے مجھ پہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے میں جس کے ہمارے ڈاکٹر صاحب نمائندے اور ترجمان ہیں، نہ یہ احساس ہے نہ اس کا حوصلہ۔ ہمارا یہ طبقہ عوام کی قیادت کرنے کی صلاحیتیں کھو چکا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موجودہ سماجی بلند مقام سے نیچے اتریں، عوام میں جائیں، ان کے سے بن کر ان کی قیادت کریں اس کے بغیر یہ ممکن نہیں لیکن ہمارے اعلیٰ طبقے کے بس میں نہیں۔''(116)

مولانا عبید اللہ سندھی کی سیاسی فکر جمہور سے شروع ہو کر جمہور پہ ختم ہوتی تھی، وہ جمہوری رویوں اور جمہوری نظام ہی کو جمہور کی بہتری کے لئے اور قوم کی مستقبل میں ترقی کا واحد زریعہ سمجھتے تھے۔ وہ معاشرے میں مسلط سیاسی و معاشی طبقاتی نظام جو کہ معاشرے کی

اکثریت کو پسماندہ رکھ کر ان کا استحصال کرتا ہے اس کے خلاف جمہوری عمل کے ذریعے تبدیلی کو لازمی قرار دیتے تھے۔فرسودہ نظام کے خلاف سیاسی بیداری کے لئے، ووٹ کی قدرو قیمت اور اجتماعی جدو جہد، خدمت خلق کے جذبے و عمل کو فروغ دینا چاہتے تھے تاکہ معاشرے کے اندر سیاسی تنظیم پیدا ہو اور لوگ اپنے حقوق کے لئے درست سمت میں جدو جہد کر کے اس طبقاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کریں۔آپ کا کہنا تھا ''ہم اپنی قوم کے کارکن عنصر کو جو ہمارے ملکوں میں عموماً کاشتکار ہے اقتصادی مصیبتوں میں گرفتار دیکھتے ہیں ان کو ان مصائب سے نجات دلانا قوم کی ہستی کے لئے ضروری ہے'' (117)

مزید بیان کرتے ہیں ''اس کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جب تک وہ اپنی اصلاح کے لئے خود کھڑا نہ ہو مگر اس اصلاح سے بیشتر اس کو تعلیم دینا ضروری ہے۔'' (118)

آپ حکومت پہ تنقید کرتے ہوئے مزید بیان کرتے ہیں کہ ''سرمایہ دار حکومت نے تعلیم چند افراد کے لئے مخصوص کر رکھی ہے اب یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے کاشتکاروں کو کالج کے گریجویٹ بنا سکیں، مگر یورپ کے طریقے پر کاشتکاروں کو عالم بنایا جا سکتا ہے۔سب سے پہلے انہیں مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہئے، اس کے لئے ہمارا عربی رسم الخط مانع قوی ہے کہ ایک ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے اس کو یہ خط سکھانا جو ایک ایک حروف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے سکھانے والے دونوں کے لئے بے حد دشوار ہے۔رومن حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں ایک دفعہ حرووف شناسی کے بعد ساری عمر کے لئے انسان فارغ ہو جاتا ہے ٹائپ رائٹر مشین کے توسط سے ہاتھ سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم مسجدوں میں ٹائپ رائٹر مشین رکھ کر اپنے بچوں کو چند گھنٹوں میں اپنی مادری زبان لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔'' (119)

مزید بیان کرتے ہیں ''جس وقت ہم اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو ہر زبان کے

لئے ایک مرکزی پریس تعلیم دینے کے لئے کافی ہے،اس میں ماہوار رسالے نکلیں گے، ہفتہ وار پرچے ہوں گے، روزنامے ہوں گے، ہر شخص اپنی زبان میں گھر بیٹھے پڑھ سکتا ہے قوموں کو اس طرح تعلیم دینے کی سہولت جس طرح اس عہد میں موجود ہے پہلے زمانے میں کسی کے خیال میں بھی نہ تھی اب ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔''(120)

مولانا عبیداللہ سندھی کے درج بالا اقتباسات اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ معاشرے کے محنت کش افراد کی تعلیم وتربیت کس قدر ضروری ہے، نیز ان کو کس طرح سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا سکتا ہے،مولانا عبیداللہ سندھی کا زمانہ آج کے دور کے مقابلے میں بہت زیادہ پسماندہ تھا،لیکن اگر آج بھی ہم اپنے ملک کا جائزہ لیتے ہیں تو محنت کش طبقات جن کی اکثریت ہے اسی طرح کی جہالت و پسماندگی کا شکار ہے اور آج بھی انہیں تعلیم وتربیت کی اشد ضرورت ہے۔مولانا عبیداللہ سندھی نے جن طریقوں کے بارے میں بیان کیا آج ان سے بہتر جدید طریقہ تعلیم اور میڈیا کے ذرائع موجود ہے جن کی مدد سے پسماندہ اور محنت کش طبقات کو تعلیم دی جا سکتی ہے،لیکن سرمایہ داری طبقاتی سیاسی نظام جس پہ استحصالی طبقات کا مکمل کنٹرول وہ کسی بھی صورت میں اس اکثریتی محنت کش طبقے کو علم کی دولت سے مستفیض نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان کو منتخب کرنے والے یہی جاہل اور بے شعور عوام ہیں اگر انہیں علم اور شعور مل گیا تو اس طبقاتی نظام کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔

مولانا عبیداللہ سندھی معاشرے کے محنت کش طبقات خاص طور پہ کسانوں کی تعلیم وتربیت کو بہت اہم قرار دیتے ہیں چونکہ اس خطے میں اکثریت زراعت سے منسلک افراد کی تھی لہذا سب سے زیادہ ان کے حقوق متاثر ہو رہے تھے،اس کی وجہ ایک تعلیم یافتہ نہ ہونا دوم اپنے سیاسی حقوق کا شعور نہ ہونا تھا۔آپ یہ چاہتے تھے کہ کسان کو ان پڑھ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر سیاسی شعور کے ساتھ پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی حاصل

کرنی چاہیئے تا کہ وہ اپنے حقوق کا بہتر طور پر دفاع کر سکے، بحیثیت قوم ترقی کی راہیں آسان ہوسکیں۔آپ فرماتے ہیں

''ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں چنانچہ ہم بھی کسان کے طرفدار ہیں ہم کسان کو تعلیم دینا چاہتے ہیں ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔انہیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔''(121)

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے خطبہ صدارت منعقدہ جمعیت الطلبہ سندھ حیدر آباد میں اسی نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم کسانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔انہیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں۔کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔ہ کسان کے لئے یہ سب کچھ چاہتے ہیں۔لیکن ہم اس کو زمیندار سے ٹکراتے اور لڑاتے نہیں۔ہمارے ملک میں زمیندار کا آج ایک درجہ ہے،وہ زمین کا لگان کسانوں سے وصول کر کے حکومت کو پہنچاتا ہے۔جب ہم حکومت سے نہیں لڑتے تو کسان کو اپنے زمیندار سے کیوں لڑائیں۔ہم جانتے ہیں کہ کس طرح اسمبلی میں جا کر زمینداروں سے کسانوں کے حقوق لئے جا سکتے ہیں۔یہ ہماری خاص بات ہے۔اوراسی لئے ہم اپنی ایک مستقل سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں۔مگر بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روس سے آئی ہوئی ایک تحریک چل رہی ہے۔اس تحریک میں کام کرنے والے کامریڈ کسان کو زمیندار سے لڑانا چاہتے ہیں۔ہم بھی چونکہ روس سے ہو کر آئے ہیں اس لئے ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم بھی کسان کو زمیندار سے لڑانے کے داعی ہوں گے۔ہمارے متعلق یہ سمجھنا ٹھیک نہیں۔''(122)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری مولانا عبیداللہ سندھی کے معاشرے کی تربیت کے حوالے

سے متعین مقاصد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''سب سے پہلے جو کام کرنا چاہئے وہ یہ کہ کسی قومی امتیاز کے بغیر خواہ امیر، کاشتکار، خواہ ہنر مند ،مرد خواہ عورت کو تعلیم سے مستفید کریں، تعلیم کی روشنی حاصل کرنے کے بعد ہی وہ صحیح طور پر (سیاسی) بات کو سمجھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔''(123)

معاشرے میں اکثریتی طبقہ جب پسماندہ ہو تو وہاں سیاسی شعور کی بھی لامحالہ کمی ہو جاتی ہے۔اور پھر خاص طور پہ ہندوستان میں ایک قوم دو سو سال انگریزوں کی بدترین غلامی میں مبتلا رہنے کے بعد ایسے سماج میں ڈھل چکی تھی جہاں ایک طرف جاگیرداروں نے جو کہ انگریزوں کے حاشیہ نشین تھے۔جنہیں انگریزوں نے غداری کے سلسلے میں جاگیریں عطا کی تھیں اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے ستعمال کیا تھا۔انہیں جاگیرداری نظام کی صورت میں ایک ایسا نظام بھی دیا جس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ آبادیوں کو زمینوں سے بے دخل کر کے انہیں اپنا دست نگر بنا کر ان کا استحصال جاری رکھیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے جاری کردہ اس جاگیرداری نظام نے معاشرے کے اکثریتی محنت کش کسان طبقے کو غلامی کی بدترین شکلوں میں مبتلا کر دیا۔اس طرح جاگیردار نے انہیں پسماندہ رکھا انہیں اپنی زمینوں پہ بیگار کیمپوں کی طرح استعمال کیا۔اور اس طرح نسل در نسل انسانوں کی لاتعداد آبادیاں بنیادی انسانی حقوق سے محروم اس جاگیرداری نظام کی نذر ہو گئیں۔ جاگیرداروں کا اپنے علاقوں پہ اس قدر تسلط تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی بھی انسان اپنے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔جاگیرداروں نے انہیں تعلیم، صحت اور بنیادی ضروریات سے ہمیشہ محروم رکھا۔جس کی وجہ سے وہ جانوروں کی طرح صرف مال برداری کرتے تھے انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔نظام کون چلاتا ہے، سیاسی ادارے کیا ہوتے ہیں، بس جاگیردار جو کہتا تھا وہ اسے بجا لاتے۔لہذا ملک کے طول وعرض میں سیاسی نظاموں کے کرتا دھرتا صرف

جا گیردار طبقہ تھا ان ہی کی نسلیں پڑھ لکھ کر اداروں میں وزیر، وغیرہ بنیں انگریزوں نے ان ہی کی نسلوں کو آگے بڑھایا، اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔رہ گیا پسماندہ محنت کش طبقہ تو وہ نسل درنسل جہالت، غربت اور محرومی کی زندگی گذراتا رہا۔مولانا عبیداللہ سندھی کو اپنے معاشرے کے اس پسماندہ طبقے کی حالت کو دیکھ کر ترس آتا تھا وہ بے حد افسردہ ہوتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ اس اکثریتی طبقے کا زیادہ حق ہے کہ وہ اپنے ملک کے سیاسی اداروں میں کردار ادا کریں۔اور جب وہ سیاسی داروں میں جانے کے قابل ہوجائیں گے تو یقیناً اپنے مسائل کو بھی بہتر نداز سے حل کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔اور ظالم اور استحصالی طبقے کے تسلط سے چھٹکارا ملے گا۔لہذا آپ نے اپنا زیادہ زور اور توجہ اسے طبقے پہ مرکوز رکھی آپ لکھتے ہیں

”’’ہمیں پسماندہ طبقے کی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ جب تک ہمارے اس طبقے کی اصلاح نہ ہوگی تب تک ملک میں کوئی بھی سودمند کام ہونا مشکل ہے۔“(124)

یہاں مولانا عبیداللہ سندھی نے نہایت ہی اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ اگر معاشرے کا اکثریتی طبقہ پسماندہ ہوگا تو اس کے نتائج اس قدر ہمہ گیر ہوں گے کہ ملک کا کوئی بھی کام سودمند نہیں ہوسکتا، اس کی مثال ہمارے میں معاشرے میں بھی موجود ہے، ستر سال سے سے وطن عزیز کا اکثریتی محنت کش طبقہ ملک پہ مسلط ان ہی جاگیرداروں وڈیروں، سرداروں، چوہدریوں اور خانوں کی نسلوں کی لوٹ مار اور، بدترین استحصال کا شکار ہے۔اب وہ جاگیرداری نظام ایک بدترین سرمایہ داری نظام میں تبدیل ہوچکا ہے، اس کے نتیجے میں وطن عزیز معاشی طور پہ دیوالیہ اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے، خاص طور پہ معاشی دیوالیہ پن صرف اس وجہ سے ہے کہ حکمران خاندانوں نے ہر دور میں عوام کے نام پہ بیرونی سامراجی اداروں سے قرضوں پہ قرضے لئے اور اپنی تجوریاں اور بینک بیلنس بنائے، آج ہمارے تمام

حکمران چاہے ان کا تعلق اقتدار سے ہو یا اپوزیشن سے سب نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے ہیں، اور اس قوم کو غربت وافلاس کے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔

اگر عوام چاہتی ہے کہ ایسا سیاسی اور معاشی نظام وجود میں آئے جو ان کے تمام مسائل کو حل کرنے والا ہو تو انہیں ووٹ کی اہمیت کو سمجھنا پڑے گا، کیونکہ اسی ووٹ کی طاقت سے وہ بہتر سے بہتر لوگوں کو منتخب کر کے انہیں اقتدار میں جانے کا حق دے سکتے ہیں۔ اگر لوگ ووٹ نہیں دیں گے یا صحیح لوگوں کو نہیں دیں گے تو پورے معاشرے کو اس کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں، اگر ووٹ کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور درست طریقے سے ووٹ نہیں کریں گے تو جمہوری رویئے معاشرے سے ناپید ہو جائیں گے، آمریت اور سرمایہ پرست گروہ کامیاب ہو جائیں گے اور استحصال اور بے انصافی کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ جیسے اس وقت ہمارے ملک کا حال ہے۔

آج کی دنیا میں لوگ ووٹ سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہیں، آدھی سے زیادہ آبادی ووٹنگ میں دلچسپی نہیں لیتی، بہت سے لوگ حکومتوں سے ناراض ہوتے ہیں اور ووٹ کی پرواہ نہیں کرتے، الیکشن کے دن قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے ان کے جو بھی مسائل ہوں انہیں ووٹنگ ضرور کرنی چاہئے۔ کیونکہ ووٹنگ ہی سے آپ اپنے حالات کو بدل سکتے ہیں، حکومت کو بدل سکتے ہیں۔ آپ کی کنارہ کشی یا عدم دلچسپی کا کوئی اثر نہیں ہوگا، لیکن آپ کے ووٹ سے ضرور اثر پڑے گا۔

دنیا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جمہوریت کو اپنانے والی اقوام نے اپنے اندرونی نظاموں کو اس طرح استوار کر رکھا ہے کہ ان کے حکمران ان کی خواہش کے خلاف حکومتی پالیسیاں نہیں بنا سکتے۔ انہیں جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے ملک کی حالت یکسر مختلف ہے، ایک پاکستانی شہری جس کی عمر اٹھارہ سال ہو وہ ووٹر بن سکتا ہے۔ اور الیکشن کے عمل میں شریک ہو

سکتا ہے۔لیکن پاکستان کے شہریوں کو الیکشن کا بہت کم تجربہ ہے، کیونکہ پہلے تیئس سال بغیر الیکشن کے ملکی سیاسی نظام چلتا رہا، جبکہ (1970-2010) قوم کو چار دفعہ آمریت کا تجربہ کرنا پڑا۔ پاکستان کا سیاسی نظام ابھی تک تجربات سے گذر رہا ہے۔ایک سروے کے مطابق پاکستان میں عام طور پہ ووٹرز کی سات قسمیں پائی جاتی ہیں، پارٹیوں سے وفاداری نبھانے والے ووٹرز، اخلاقی قدروں کے متلاشی ووٹرز، مختلف نوعیّتوں کی مدد کے متلاشی ووٹرز، قانون و سیاست سے دلچسپی رکھنے والے ووٹرز، ملکی وقومی ترقی کے متلاشی ووٹرز، مسالک وبرادریوں کو سپورٹ کرنے والے ووٹرز اور بےیقینی کی کیفیت میں مبتلا ووٹرز" ہمارے ہاں چونکہ تعلیم اور سیاسی شعور کی انتہائی کمی ہے جس کی وجہ سے اکثر ووٹرز کو تمام مسائل کا پتہ نہیں ہوتا، وہ صرف عام قسم کی معلومات پہ انحصار کرتے ہیں، یا مختلف قسم کے پروپیگنڈے، یا بحث ومباحثہ یا میڈیا خبروں سے متاثر ہوتے ہیں۔اور اس غفلت اور بےشعوری کے ساتھ ساتھ ووٹنگ کے اوپر بہت سے دوسرے عوامل بھی اثرانداز ہوتے ہیں جن میں جنسی امتیاز، مذہبی، نسلی ولسانی امتیاز، معاشی بدحالی وغیرہ فرقہ وارانہ اور مسلکی، تشدد پسندی بھی الیکش کے عمل کو متاثر کرتی ہے۔اس کے علاوہ عام طور پہ لوگ اپنا آپ کو ووٹر رجسٹرڈ کروانے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔

ہمارے ہاں خاص طور پہ خواتین کی حالت زار کافی افسوسناک ہے، دیہی علاقوں میں ہوں یا شہری خواتین ہوں سیاسی حوالے سے ان کی شرکت تسلی بخش نہیں۔قبائلی رسم ورواج ودیگر سیکورٹی کے مسائل انہیں اس سے دور رکھتے ہیں۔ایک خبر کے مطابق تازہ ترین الیکشن میں نو ہزار پولنگ اسٹیشنوں میں سے پانچ سو ایسے تھے جہاں خواتین نے ووٹ نہیں ڈالا۔ہمارے ہاں حالت تو یہ ہے کہ جو خواتین ووٹ ڈالنے بھی جاتی ہیں تو ان میں اکثریت خواتین کے ووٹ کے لئے امیدوار کا نام اور اس کا نشان اس کا خاوند یا گھر کا کوئی مرد تجویز کرتا ہے، وہ اپنی

مرضی سے اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کرسکتی۔نہ ہی انہیں اتنی معلومات میسر ہوتی ہیں کہ وہ حکومت کی پالیسیوں،امیدواروں کے کرداراور دیگر معاشی وسیاسی حوالے سے پالیسیوں کی معلومات تک رسائی رکھیں،زیادہ تر خواتین کی آبادی ان پڑھ ہے،جیسا خاوند،والد یا بھائی نے کہا ویسا کرنا ہے،جسے انہوں نے کہا ووٹ دینا ووٹ دیتی ہیں،اگر انہیں کہا جاتا ہے کہ ووٹ کے لئے نہیں جانا تو وہ اس کی جرات نہیں کرسکتیں۔

ہمارے ہاں المیہ ہے کہ سیاسی میدان میں حقیقی جمہوریت کا نام ونشان نہیں ہے،سیاسی پارٹیاں لوگوں کی جمہوریت یا ووٹ کے حوالے سے کیا تربیت کریں گی خود ان کے اندر جمہوری رویئے موجود نہیں،پارٹیوں پہ نسل در نسل خاندانی تسلط ہوتا ہے،یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خاندانی پارٹیاں ہیں نہ کہ جمہوری پارٹیاں۔

جھوٹے اور کرپٹ سیاستداں جن کے جھوٹ کو میڈیا صبح وشام ٹی وی سکرین پہ دکھاتا ہے لیکن ہم آنکھیں چرا کر پھر انہیں ووٹ دیتے ہیں یا بالکل ہی ووٹنگ کے عمل سے الگ ہو جاتے ہیں،یہ دونوں طرز عمل درست نہیں،آپ ووٹ کریں صحیح قیادت کو صحیح امیدوار کو،آگے بڑھیں اپنے اس حق کی طاقت کو خوب استعمال کریں۔ہم اپنے ووٹ کی طاقت سے ان چوروں،جھوٹوں اور ملک وقوم کے غداروں کو اپنے سیاسی نظاموں اور اداروں سے فارغ کر سکتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی اس فکر کو معاشرے میں پھیلانے کی ضرورت ہے کہ لوگ دور کے تقاضوں کا ادراک کریں اور یہ سمجھیں کہ اگر وہ ووٹ کا حق استعمال نہیں کریں گے،تو ان کی معاشی وسیاسی مشکلات میں کمی نہیں آئی گی،وہ اپنے ووٹ سے اپنا حق لے سکتے ہیں،ووٹ کی طاقت سے وہ سماجی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر کرسکتے ہیں،اگر ووٹ نہیں دیں گے تو صرف مالدار سرمایہ پرست طبقہ ملکی اقتدار و اداروں پہ قابض رہے گا اور غربت وافلاس اور بے

انصافی معاشرے میں پھیلائے گا۔مزدوروں، کاشکاروں، اور دیگر شعبوں کے جسمانی اور دماغی محنت کرنے والے افراد کو اپنی اپنی تنظیمیں بنانی چاہئیں اور اپنے نمائندے الیکشن میں کھڑے کر کے انہیں اسمبلی میں پہنچانا چاہئے تا کہ وہ وہاں پہنچ کر ان کے لئے بہتر پالیسیاں بنانے میں کردار ادا کر سکیں۔ہمیں معاشرے میں ووٹ کی اہمیت کے بارے میں ہر سطح پہ تربیت کا اہتمام کرنا چاہئے، تا کہ ہر سطح کے افراد کو اس کی اہمیت کا احساس ہو سکے کیونکہ صرف یہ ایک واحد ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے تعلیمی، سیاسی، معاشی، سماجی نظاموں کو بدل سکتے ہیں۔اور استحصالی طبقات سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

جب مولانا عبیداللہ سندھی انگریز سامراج کے خلاف ایک طویل عرصہ کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس آئے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا

''میری صرف یہی آرزو ہے اور اس کے لئے میں وطن آنے پر آمادہ ہوا،میری زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اور ہیں، چاہتا یہ ہوں کہ میں اپنے اس فکر سے لوگوں کو متعارف کرا دوں۔''(125)

آج نوجوان نسل کی اولین ذمہ داری ہے کہ آپ کی اس ترقی پسند فکر کو ان کی آرزو کے مطابق معاشرے تک پہنچائیں اور قومی زندگی میں عصر حاضر کے مطابق تبدیلی کی راہیں ہموار کریں۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔عبید اللہ سندھی،مولانا،قرآنی شعور انقلاب،(جمع ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی،غازی خدا بخش مرحوم)لاہور،مکی دار الکتب،1997،ص79

2۔ایضاً،ص173

3۔عبید اللہ سندھی،مولانا تفسیر المقام المحمود ،(قلمبند:مولانا عبداللہ لغاری ولی الہیٰ۱۹۳۳ء)،مع ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود ،حیدر آباد،انٹرنیشنل بک فاؤنڈیشن،1959،ص22

4۔ایضاً،ص23

5۔عبید اللہ سندھی،مولانا،قرآنی شعور انقلاب،(جمع ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی،غازی خدا بخش مرحوم)،محولہ بالا،ص95

6۔صوفی عبد الحمید سواتی،مولانا،مولانا عبید اللہ سندھی کے علوم وافکار ناشر ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ1990ء،ص45

7۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دار التحقیق و الشاعت،لاہور، 2002، ص467

8۔ایضاً،ص94

9۔ایضاً،ص468

10۔ایضاً،ص206 تا208

11۔عبید اللہ سندھی،مولانا، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، لاہور،کتاب خانہ، 1942،ص80

12۔سرور، پروفیسر، حالات، تعلیمات و سیاسی افکار عبید اللہ سندھی ، سندھ ساگر اکیڈمی،1943،ص371

13۔ایضاً،ص371

14۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و الشاعت،لاہور،2002، ص453

15۔ایضاً،ص465

16۔ایضاً،ص88

17۔ایضاً،ص356

18۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات (مرتبہ پروفیسر سرور)،محولہ بالا،ص117

9 1۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و الشاعت،لاہور،2002،ص294

20۔ایضاً،ص468

21۔ایضاً،ص345

22۔محمد سرور، پروفیسر،مولانا عبید اللہ سندھی حالات ،تعلیمات،سیاسی افکار، لاہور،المحمود اکیڈمی،1967،ص259 تا260

23۔مکاتیب عبید اللہ سندھی، مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری،ناشر،مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی پاکستان،کراچی،1997،ص43

24۔عبیداللہ سندھی،مولانا،شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک،لاہور،کتاب خانہ،1942،
ص32,33
25۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)محولہ بالا،ص463
26۔ایضاً،ص422
27۔ایضاً،ص422
28۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)محولہ بالا،ص423
9 2۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و
الشاعت،لاہور،2002،ص366
3 0۔محمد سرور ،پروفیسر، خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی،لاہور،سندھ ساگر
اکیڈمی،1996ء،108
31-ایضاً،ص15 تا17
32-عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و الشاعت،لاہور،2002 ،
ص318
33-ایضاً،ص318
3 4۔محمد سرور ،پروفیسر،خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی،لاہور،سندھ ساگر
اکیڈمی،1996ء،ص109
35۔ایم اے،اکبرعلی،پاکستان جدید دور کے تقاضے،لاہور،تخلیقات،2000ء،ص263
3 6- محمد سرور ،پروفیسر، خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی،لاہور،سندھ ساگر
اکیڈمی،1996ء،ص109
37- ایضاً،ص261

38۔محمد سرور، پروفیسر،افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھی،محولہ بالا،ص165

39۔محمد سرور ،پروفیسر، خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996ء،ص231

40۔محمد سرور، پروفیسر،افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھی،محولہ بالا،ص348

41۔ایضاً،ص348

42۔ سرور، پرو فیسر، حالات، تعلیمات و سیاسی افکار عبید اللہ سندھی ، سندھ ساگر اکیڈمی،1943،ص370

43۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و الشاعت،لاہور،2002،ص363

44۔ایضاً

45۔ایضاً،ص366

46۔ایضاً

47۔عبیداللہ سندھی،مولانا،شاہ لی اللہ اوران کی سیاسی تحریک،کتاب خانہ پنجاب لاہور، 1942ء،ص9

48۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات ومقالات،دارالتحقیق و الشاعت،لاہور،2002،' ص326

49۔ایضاً،ص339

50۔شاہجہان پوری ،ابو سلمان،ڈاکٹر،مو لانا عبید اللہ سندھی حیات و خدمات،لاہور،دارالکتاب،2007ء352,

51۔ایضاً،ص329

52۔ ایضاً ص372

53۔ ایضاً، 350

54۔ ایضاً ص351

55۔ مکاتیب عبیداللہ سندھی، مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری، محولہ بالا، ص 51

56۔ شاہجہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا عبیداللہ سندھی حیات و خدمات، محولہ بالا، ص358, تا359

57۔ ایضاً ص360

58۔ ایضاً ص360

59۔ ایضاً ص361

60۔ ایضاً ص362

61۔ ایضاً ص362

62۔ عبید اللہ سندھی، مولانا، خطبات و مقالات، لاہور، دار التحقیق والشاعت، 2002ء، ص486

63۔ ایضاً ص432

64۔ ایضاً ص، ص446

65۔ ایضاً ص454

66۔ ایضاً ص362

67۔ ایضاً ص320

68۔ ایضاً ص321 تا320

69۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، افادات وملفوظات (مرتبہ پروفیسر سرور) محولہ بالا، ص227

70۔ عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات و مقالات،لاہور،دار التحقیق والشاعت،2002ء ،ص83

71۔عبیداللہ سندھی،مولانا،قرآنی شعورانقلاب،(جمع ترتیب شیخ بشیراحمدلدھیانوی،غازی خدابخش مرحوم)،محولہ بالا،ص397

72۔ایضاً،ص54 تا55

73۔عبید اللہ سندھی ،مولانا،شعور وآگہی(افادات عبید اللہ سندھی)مرتب سید مطلوب زیدی،محولہ بالا،ص136 تا137

74 ۔عبیداللہ سندھی، مولانا ،شعور وآگہی(افادات مولانا سندھی) ،لاہور،مکی دارالکتب،1994ء،ص137

5 7۔محمد سرور ،پروفیسر،مولانا عبید اللہ سندھی حالات ،تعلیمات،سیاسی افکار،محولہ بالا،ص232

76۔ایضاً،ص240

77۔ایضاً،ص328 تا329

78۔ایضاً،ص327

79۔عبیداللہ سندھی،مولانا،قرآنی شعورانقلاب،(جمع ترتیب شیخ بشیراحمدلدھیانوی،غازی خدابخش مرحوم)،محولہ بالا،ص221

80۔ایضاً،ص168

81۔ایضاً،ص126

2 8۔محمد سرور،پروفیسر،افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبید اللہ سندھی،محولہ بالا،ص511 تا512

83۔ایضاً ص512

84۔ایضاً ص347

85۔ایضاً ص512

86۔عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی شعور انقلاب، (جمع ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی، غازی خدابخش مرحوم) محولہ بالا ص124 تا125

87۔محمد سرور ، پروفیسر، خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی، لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی، 1996ء، ص154

88۔مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات، محمد اسلم، ندوۃ المصنفین ، لاہور، ص43

89۔ محمد سرور، پروفیسر، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، محمد سرور، پروفیسر، خطبات ومقالات عبیداللہ سندھی، لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی، 1996ء، ص265

90 ۔عبید اللہ سندھی، مولانا ، خطبات و مقالات، لاہور، دار التحقیق والشاعت، 2002ء، ص347

91۔ایضاً ص348

92۔عبید اللہ سندھی، مولانا تفسیر المقام المحمود ، (قلمبند: مولانا عبداللہ لغاری ولی الہیٰ ۱۹۳۳ء)، مع ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود ، حیدر آباد، انٹرنیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۵۹ء، ص122

93۔عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی شعور انقلاب، (جمع ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی، غازی خدابخش مرحوم) محولہ بالا، ایضاً ص128 تا129

94۔محمد سرور ، پروفیسر، خطبات ومقالات عبید اللہ سندھی، لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی، 1996ء، ص216 تا217

95۔ایضاً, ص225 تا226

96۔عبیداللہ سندھی،مولانا،قرآنی شعور انقلاب،(جمع ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی،غازی خدابخش مرحوم)محولہ بالا،ص197

97۔محمد سرور ،پروفیسر،مولانا عبید اللہ سندھی حالات ،تعلیمات،سیاسی افکار،محولہ بالا،ص255

98۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات و مقالات،،لاہور،دار التحقیق والشاعت2002،ص282

99۔شاہجہان پوری ،ابو سلمان،ڈاکٹر،مو لانا عبید اللہ سندھی حیات و خدمات،محولہ بالا،ص393

100۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996ء،ص441تا 442

101۔محمد سرور،پروفیسر،خطبات ومقالات،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996،ص262

102۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات و مقالات،لاہور،دار التحقیق والشاعت2002،ص169 تا170

103۔ایضاً،ص466

104۔محمد سرور ،پروفیسر،خطبات ومقالات،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996،،ص148 تا149

105۔ایضاً،ص268 تا269

106۔ایضاً،ص262

107۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)،لاہور،سندھ ساگر

اکیڈمی،1996،441

108۔محمد سرور ،پروفیسر،خطبات ومقالات،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی، 1996،محولہ بالا110

109۔ایضاً،ص110

110۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات و مقالات،لاہور،دار التحقیق والشاعت2002،ص296

111۔محمد سرور، پروفیسر،خطبات ومقالات،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996،ص118

112۔ایضاً،ص154

113۔شاہجہانپوری،ابوسلمان،ڈاکٹر،مقالات مولانا عبیداللہ سندھی،کراچی،مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی،۱۹۹۴ء،ص121 تا122

114۔ایضاً،ص122

115۔محمد سرور، پروفیسر،خطبات ومقالات،لاہور،سندھ ساگر اکیڈمی،1996،ص132

116۔ایضاً،ص441

117۔عبیداللہ سندھی،مولانا،شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک(حزب ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ)،ناشر،کتاب خانہ پنجاب لاہور،1942ء،ص81

118۔ایضاً

119۔ایضاً

120۔ایضاً،ص82

121۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)محولہ بالا،ص148

122۔عبید اللہ سندھی،مولانا ،خطبات و مقالات،لاہور،دار التحقیق

والشاعت2002،ص466

3 2 1۔شاہجہان پوری ،ابو سلمان،ڈاکٹر،مو لانا عبید اللہ سندھی حیات و خدمات،لاہور،دارالکتاب،2007ء،334

124۔ایضاً،ص335

125۔عبیداللہ سندھی،مولانا،افادات وملفوظات(مرتبہ پروفیسر سرور)محولہ بالا،ص207

''نئے سماج کی تشکیل کی ضرورت''

مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں

''جب مَیں انجن اور ہوائی جہاز کو دیکھتا ہوں تو یہ جان کر کہ میری قوم نے اس کو نہیں بنایا، میرے اندر آگ لگ جاتی ہے، جو قوم ہوائی جہاز اور انجن سے غافل ہے وہ قوم مردہ ہے، بے جان ہے۔ جب تک ہم اپنے شاہ پرستانہ سماج کو جواب فرسودہ ہو چکا ہے ختم نہیں کریں گے اور یورپین انداز پر اس کی تعمیر نو نہیں کریں گے ہمارا کوئی مستقبل نہیں، یہ دور مشین کا ہے۔ اور مشین کے لئے نیا سماج چاہئے، پرانا سماج اور نئی مشین ایک ساتھ نہیں رہ سکتے''۔

(بحوالہ: افادات وملفوظات، مولانا عبیداللہ سندھی، ص423)

نئے سماج کی تشکیل

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں

''جب میں انجن اور ہوائی جہاز کو دیکھتا ہوں تو یہ جان کر کہ میری قوم نے اس کو نہیں بنایا، میرے اندر آگ لگ جاتی ہے، جو قوم ہوائی جہاز اور انجن سے غافل ہے وہ قوم مردہ ہے، بے جان ہے۔ جب تک ہم اپنے شاہ پرستانہ سماج کو جواب فرسودہ ہو چکا ہے ختم نہیں کریں گے اور یورپین انداز پر اس کی تعمیر نو نہیں کریں گے ہمارا کوئی مستقبل نہیں، یہ دور مشین کا ہے۔ اور مشین کے لئے نیا سماج چاہئے، پرانا سماج اور نئی مشین ایک ساتھ نہیں رہ سکتے''۔

(بحوالہ افادات وملفوظات، مولانا عبید اللہ سندھی، ص 423)

(مصنف کا مختصر تعارف)

''مصنف عبید اللہ سندھی کی فکر سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں، آپ نے جامعہ کراچی سے سیاسیات میں ماسٹر اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کا اعزاز حاصل کیا، آپ کے کئی سیاسی وسماجی موضوعات پر مبنی مضامین قومی، مقامی اخبارات اور مجلات میں شائع ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ مختلف آن لائن نیوز پیپرز میں بھی آپ کے مضامین شائع ہو چکے ہیں، تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مصنف کی اس کتاب کے حوالے سے اپنی آراء ای میل javed0260@gmail.com پہ بھیجی جاسکتی ہیں''۔

Design By: 0300-4529621
MUHAMMAD AHSUN Gull

ISBN: 978-969-9730-32-0

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون: 0092-42-37239884-37320318
ای میل: kitabsaray@hotmail.com